نیم خواب

شاذ تمکنت

نژاد کتاب گھر

۱۷۳، معظم پورہ
حیدرآباد
آندھرا پردیش

سنہِ اشاعت — ۱۹۷۷ء

تعداد — ایک ہزار

معاونت { اُردو اکیڈیمی حیدر آباد، آندھرا پردیش
ایچ ای ایچ دی نظامس ٹرسٹ، حیدر آباد

کتابت — محمد عارف الدین

سرِ ورق — سلاؔم خوشنویس

طابع — اکسل فائن آرٹ لیتھو اینڈ آفسٹ ورکس حیدر آباد

جِلد بند — محمّدیہ بُک بائنڈنگ ورکس، چھتہ بازار، حیدر آباد

مِلنے کے پتے:

— اُردو اکیڈیمی حیدر آباد، آندھرا پردیش

— نیشنل بُک ڈپو، چار کمان، حیدر آباد

— اِلیاس بُک ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ روڈ، حیدر آباد

— حسامیہ بُک ڈپو، چار کمان، حیدر آباد

— نژاد کتاب گھر، ۱۷۳۔ معظم پورہ، حیدر آباد (فون نمبر ۳۵۴۰۰)

قیمت

پندرہ روپے

❋

نام	سید مصلح الدین
قلمی نام	شاذ تمکنت
پیدائش	۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء حیدرآباد
تعلیم	ایم۔ اے (عثمانیہ)
پیشہ	ریڈر شعبۂ اردو (جامعۂ عثمانیہ)
پہلا مجموعہ	تراشیدہ ۱۹۶۶ء
دوسرا مجموعہ	بیاضِ شام ۱۹۷۳ء
تیسرا مجموعہ	نیم خواب ۱۹۷۷ء
چوتھا مجموعہ	دستِ فرہاد (انتخاب) زیرِ طبع زیرِ اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

❋

"پچھلے بیس برس میں اُردو شاعری میں جو نئے نام آئے ہیں اُن میں شاذؔ تمکنت کا نام بہت اہم ہے۔ شاذؔ کی شاعری کا اپنا ایک مزاج ہے۔ لفظوں کا استعمال تشبیہات اور موضوع کے ساتھ لفظوں کی ہم آہنگی کے علاوہ ان کی غنائیت اور غنائیت میں فکر کا عنصر جو نعرہ نہیں، اِن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ یہ خوبی اِن کی نظموں ہی میں نہیں ان کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ دونوں اصناف پر انھیں جو قدرت حاصل ہے ان کے معاصرین میں خال ہی کوئی اس خوبی کا حامل ہے۔ یہی خوبی انھیں اپنے معاصرین سے الگ بھی کرتی ہے اور ممیّز بھی۔ ان کی شاعری یقیناً اُردو شاعری کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔"

اخترالایمان

امتیاز کے نام

ترتیب

ڈاکٹر مغنی تبسم

تزئین

راشد آذر

اُز بُنِ ہر مژہ صَد قطرۂ خُوں بیشں چکید

(حافظؒ)

نعت

آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا
دُنیا جیسے ایک کھلونا
ہر پہلو رنگین سلونا
عُمر کٹی ہے سمجھانے میں
اپنے آپ کو بہلانے میں
دفترِ حسرت اپنے خدا کے آگے کیسے کھولوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا

جی غم سے ہے بوجھل بوجھل
رات اندھیری گھیرے بادل
اپنے گناہوں کی ہے کہانی
بہتے ہوئے اشکوں کی زبانی
سب کے آگے کیسے بولوں، تنہائی میں بولوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا

بھیڑ بہت ہو گی تو کیا غم
میرا مقدّر دیدۂ پُرنم
جب مہکے خوشبوئے بہاری
جب اُترے جلوے کی سواری
میں تو سراپا نادم پیچھے پیچھے ہو لوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا

کوئی کیا دے کوئی کیا لے
حُسنِ طلب کے ڈھنگ نرالے
کس سے مانگوں کیا کیا مانگوں
دُنیا مانگوں، عُقبیٰ مانگوں
آپ کے دستِ کرم سے لوں گا سوچ رکھا ہے جو لوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا

کس سے پیماں باندھ رہا ہوں
خاک ہوں لیکن میں بھی کیا ہوں
کس کے ہجر کا غم سہتا ہوں
میری سُنو میں سچ کہتا ہوں
گاہک ہوں گے چاند اور سورج جب اشکوں کو تولوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا

شاذؔ وطن میں بے وطنی ہے
آگے دیکھو چھاؤں گھنی ہے

ہجر کا قصّہ پاک کرو بھی
دامنِ جاں اب چاک کرو بھی

عمر کی رات آنکھوں میں کٹی ہے پَل دو پَل کو سو لوں گا
آپ اکیلے مل جائیں تو دامن تھام کے رو لوں گا

○

قطعات

کیف، اُمید، انبساط، اُمنگ
پئے دیدار لے کے جاتا ہوں
درد، وارفتگی، کسک، اُلجھن
لَوٹتے وقت ساتھ لاتا ہوں

○

ڈوبتا زرد سا مہتاب دمِ آخرِ شب
مجھ کو معلوم نہ تھا رُوح کو دہلاتا ہے
نگہِ جورِ عزیزانِ سُبک سر کا ملال
تیری چاہت، ترے الطاف سے مٹ جاتا ہے

○

کتنے تلخاب اُتارے ہیں تہِ کام و دہن
کتنے صحراؤں کی پہنائیاں کاٹیں میں نے
مدّتوں بعد کھُلا رازِ تمنّا مجھ پر
محفلیں بوئی تھیں، تنہائیاں کاٹیں میں نے

○

○

کوئی تو آکے رُلا دے کہ ہنس رہا ہوں میں
بہت دنوں سے خوشی کو ترس رہا ہوں میں

سحر کی اوس میں بھیگا ہوا بدن تیرا
وہ آنچ ہے کہ چمن میں جُھلس رہا ہوں میں

قدم قدم پہ بِکھرتا چلا ہوں صحرا میں
صدا کی طرح مکینِ جرس رہا ہوں میں

کوئی یہ کہہ دے مری آرزو کے موتی سے
صدف صدف کی قسم ہے برس رہا ہوں میں

حیاتِ عشق مجھے آج اجنبی نہ سمجھ
کہ سایہ سایہ ترے پیش و پس رہا ہوں میں

نفس کی آمد و شد بھی ہے سانحہ کی طرح
گواہ رہ کہ ترا ہم نفس رہا ہوں میں

جہاں بھی نور ملا کھِل اُٹھا شفق کی طرح
جہاں بھی آگ ملی خار و خس رہا ہوں میں

میں کیا کروں کہ مری آس ٹوٹتی ہی نہیں
شعاعِ روزنِ بابِ قفس رہا ہوں میں

نہ چھو سکے کوئی مجھ کو نہ میں کسی کے لیئے
کسی شوالے کا جیسے کلس رہا ہوں میں

تلاشِ نغمۂ آوارہ کائنات مری
تمام تار شکستہ ہیں کس رہا ہوں میں

حیات راہ کی دیوار بن گئی ہے شاذ
اک آئینہ ہے شب و روز ڈس رہا ہوں میں

○

کاروبارِ سحر و شام میں نقصان نہیں
ہائے وہ شخص کہ جس کا کوئی ارمان نہیں

یہ بجا ہے کہ ابھی جسم کا زندانی ہوں
یہ غلط ہے کہ مری رُوح پشیمان نہیں

تُو ابھی تک مرے جینے کا سبب ہو جیسے
تو مرے ساتھ نہیں میرا نگہبان نہیں

بڑھ گئے اور بھی غم اک ترے کم ملنے سے
یوں بھی اِس دور میں جینا کوئی آسان نہیں

یا صبا ہی مرے ویرانہ سے برگشتہ ہے
یا تری نکہتِ گیسو ہی پریشان نہیں

میرے دروازہ پہ پھر تیری سواری ٹھہرے
کیا کوئی آس نہیں کیا کوئی امکان نہیں

ایک جیسے نظر آتے ہیں مجھے سب چہرے
تُو کہاں ہے کہ کسی رنگ کی پہچان نہیں

شاذؔ ہونٹوں پہ دُعا آ کے پلٹ جاتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ الفاظ میں اب جان نہیں

○

دامن ہے دُور اور گِلے نارسا کے ہیں
یعنی ہمارے ہاتھ فقط اب دُعا کے ہیں

باغِ وفا میں جھوم رہی ہے کلی کلی
جھونکے جو لگ رہے ہیں وہ بادِ فنا کے ہیں

دشواریِ حیات میں کھو سے گئے ہیں ہم
گویا یہ مرحلے ترے بندِ قبا کے ہیں

تیری سپردگی نے مجھے خاک کر دیا
دل میں جو زخم ہیں تری مہر و وفا کے ہیں

نشانہ ہلا ہلا کے جگاتے ہیں روز و شب
جتنے پیام ہیں مرے دیر آشنا کے ہیں

تلوار کی طرح ہے زمانہ کھنچا ہوا
سارے غبار جیسے تری خاکِ پا کے ہیں

کیوں ناخدا سے شکوۂ موجِ بلا ہے شاذ
کشتی اُدھر چلی ہے جدھر رُخ ہوا کے ہیں

○

ذوقِ تنہائی فزوں ہو گیا کم تھا پہلے
کیا کہیں تیری رفاقت کا بھرم تھا پہلے

فرق ہی کیا ہے نظر آئے کہ چھپ جائے کوئی
اب مرے حق میں خدا ہے جو صنم تھا پہلے

آج مغرور ہی کہلاتے ہیں، ایسا ہی سہی
تیری چوکھٹ تھی تو سر اپنا بھی خم تھا پہلے

جاگ اُٹھا پھر وہی سویا ہوا غم تیرے بعد
تجھ سے ملتے ہوئے جس بات کا غم تھا پہلے

آج اک دوسرے کو دیکھ کے رہ جاتے ہیں
شاذؔ کیا روتے تھے کیا عیشِ بہم تھا پہلے

درد پذیرائی

جی میں ہے خاطرِ بے تاب کا افسانہ لکھوں
حالِ جاناں نہ کہوں، نازشِ تُرکانہ لکھوں

جانبِ شہرِ تمنّا دل دیوانہ چلے
گُل کھِلے، ساز چھڑے، رنگ اُڑے، شمع جلے

عقل کو صید کروں، عشق کو صیّاد کروں
وہی اسباق جو ازبر ہیں، اُنھیں یاد کروں

پھُول سی خُوشبو ہے دُہرائی ہوئی باتوں میں
کتنی صُبحوں کا اُجالا ہے مری راتوں میں

میری تقویمِ محبت کے شب و روزِ وفا
ادب و شعر کی تاریخ و روایت سے جُدا

آدمی زاد کو قاتل نہیں کہتا زنہار
زُلف کو مار سمجھتا ہوں نہ ابرو کو کٹار

فطرتِ حُسن ہے سرتا بہ قدم سوز و گداز
میں نے دیکھے ہی نہیں جور و جفا کے انداز

چمنِ عشق میں پائی ہی نہیں بُوئے رقیب
مطلعِ شوق پہ اُبھرا ہی نہیں رُوئے رقیب

حُسن آما جگہِ نُور ہے مشرق کی طرح
میں نے معشوق بھی پایا ہے تو عاشق کی طرح

آنکھ اٹھاتا ہوں تو وہ آنکھ جُھکی جاتی ہے
لب ہلاتا ہوں تو تائید ہوئی جاتی ہے

وہ کہ ہے نازِ حرم، لطف و کرم، قول و قسم
بہرِ انفاسِ خدا ہے پئے نظّارہ صنم

جانبِ قبلۂ خُوباں سے گھٹا آتی ہے
کوئے نازش سے قدم لینے ہوا آتی ہے

سخت مشکل ہے یہاں تفرقۂ ناز و نیاز
میری آواز بنی جاتی ہے دوہری آواز

ہاتھ بڑھتے ہیں تو ملتے ہیں سہارے کیا کیا
یم بہ یم دجلہ بہ دجلہ ہیں کنارے کیا کیا

روشنی چہرے پہ دیدار کی تقریب کی طرح
وہ نمو یافتہ قامت کسی تشبیب کی طرح

جسم کے خط ہیں کہ باریک قلم کی تحریر
صاف و شفّاف کہ تقدیر رقم کی تحریر

بجلیاں پس کے گھُلی جاتی ہیں رُخساروں میں
ست رنگے پھول کھِلے جاتے ہیں انگاروں میں

صفِ مژگاں کہ سوئمبر کا سماں ہو جیسے
نکہتِ زُلف کہ خوشبو کا دھُواں ہو جیسے

موجۂ رنگ، سرِ بادِ شمال اُڑتا ہے
دیکھنا پائے حِنائی سے گلال اُڑتا ہے

وہ لگاوٹ کا تقاضا ہے کہ لے لے سب کچھ
وہ نظر گفتنی، ناگفتنی کہہ دے سب کچھ

چُستیِ عضوِ بدن جوششِ دریا جیسے
ٹوٹنے والا ہو چڑھتا ہوا چلّہ جیسے

لب کہ گُل بستہ و غنچہ صفت و شہد آثار
لب کہ بیمار مسیحا ہو مسیحا، بیمار

لب کہ ہر ذرّۂ بے جاں کو کریں نُطق فشاں
لب جنھیں دیکھ کے ہو قُم کے تقاضہ کا گماں

لب کہ خلوت میں کھُلیں جیسے کھُلے ساتواں در
اور محفل میں رہیں دولتِ ممسک بن کر

آنکھیں سوئی ہوئی، روئی ہوئی بوجھل آنکھیں
گھر کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی پاگل آنکھیں

دہر افروزِ وفا ساغرِ جم ہیں آنکھیں
اپنے سمٹے ہوئے پیکر کا بھرم ہیں آنکھیں

صاف ترشی ہوئی خورشید کی پھانکیں آنکھیں
روزنِ در میں بنیں زر کی شعاعیں آنکھیں
دل کی دھڑکن کی بھی آواز سنیں وہ آنکھیں
شورشِ دہر میں سناٹے بنیں وہ آنکھیں
آنکھیں، ترسی ہوئی، برسی ہوئی، پیاسی آنکھیں
چور، سرشار، گراں بار، نِنداسی آنکھیں
تنکے چنتی ہوئی، روئی ہوئی، حیراں آنکھیں
سنگ پلکوں سے ہٹاتی ہوئی گریاں آنکھیں
میں اِنہی آنکھوں کی تنویر لئے پھرتا ہوں
ایک تصویر سی تصویر لئے پھرتا ہوں

میں کہ محرومِ تماشہ نہ پشیمانِ وصال
پھر مرے آئینۂ دل پہ ہے کیوں گردِ ملال
سوچتا ہوں کہ مرے عشق کی فطرت کیا ہے
میری افتاد ہے کیا میری طبیعت کیا ہے
کامرانی پہ بھی دل کیوں سپر انداختہ ہے
وہ خرد باختہ ہے میں نے کہ جنوں ساختہ ہے
رات بھر جاگتا رہتا ہے سرہانے کوئی غم
ڈھونڈھتا پھرتا ہے کیا کچھ نہ بہانے کوئی غم
حسن کو کس نے سکھایا ہے نگہباں ہونا
کوئی دیکھے تو مرا بے سر و ساماں ہونا

آنکھ خونابہ فشاں کب ہے کہ دامن ڈھونڈوں
کُنجِ گُل پایا ہے کیوں شاخِ نشیمن ڈھونڈوں

سببِ شکوہ نہیں آہ کروں یا نہ کروں
پہلو آباد ہے کس واسطے پہلو بدلوں

پھر یہ موہوم رگِ جاں کی کسک کیا ہوگی
سینۂ شوق میں نشتر کی کھٹک کیا ہوگی

ایک پیمانہ سا آنکھوں میں چھلکتا کیا ہے
دل تو شیشہ ہے یہ پتھر یہ دھڑکتا کیا ہے

شور سا اُٹھتا ہے کیوں پچھلے پہر دل کے قریب
کون رہرو ہے جو لُٹ جاتا ہے منزل کے قریب

کِس کو دکھلاؤں کہ کیا کیا نظر آتا ہے مجھے
دہر یک گوشۂ صحرا نظر آتا ہے مجھے

گاہ دوری میں سکوں ملتا ہے، بےچین آتا ہے
دل مگر وردِ شکیبائی سے تھراّتا ہے

لمحہ لمحہ بھی قیامت ہے کہ بھاری گذرے
زندگی صورتِ انفاس شماری گذرے

بات تو جب تھی کہ ہوتا کوئی بیداد کا زخم
زخم نغمہ ہے نہیں نالہ و فریاد کا زخم

ایک ہی درد کی پہچان نہ ہوتے اے کاش
ہم کہ یک قالب و یک جان نہ ہوتے اے کاش

گنگنانے پہ اگر ساز نہ دیتا کوئی
میری آواز پہ آواز نہ دیتا کوئی
لُطف کرتا نہ کوئی ناز اُٹھاتا نہ کوئی
میری ہر بات سے سو راز بناتا نہ کوئی
میں کہ نشتر بہ رگِ جاں نہیں ہوتا اے کاش
رختِ دل چاک گریباں نہیں ہوتا اے کاش
کس کو معلوم تھا ہوتی ہے مسرّت بھی حزیں
حُسن کی خُو بھی حزیں عشق کی فطرت بھی حزیں
مدّتوں بعد کھُلا عقدۂ مشکل مجھ پر
تنگ ہے راہِ جنوں سخت ہے منزل مجھ پر
آگ سی آگ رگ و پے میں سمونا ہے ضرور
وہ کرم ہو کہ ستم عشق میں رونا ہے ضرور

○

کمیں گاہ

شاذ کیا رات ہے، کیا تیز ہوا ہے مری جاں
تم کہاں اپنے چراغوں کو جلانے نکلے
تم نے دستک دی ضمیروں کے نہاں خانہ پر
اژدر و مار کے مسموم ٹھکانے نکلے
تم نے رنگین نقابوں کو بھی چہرہ جانا
کتنے ہُشیار ہو تم، کتنے سیانے نکلے

گر یہی نائب یزداں ہیں تو ابلیس ہے کون
کون جیتا ہے یہاں حق کے رسولوں کی طرح
شام ڈھل جائے تو پھر پھُول کی اوقات ہے کیا
جاوداں کون ہے صحرا کے ببولوں کی طرح
دست و بازوئے عدالت سے لہو جاری ہے
منصفی ٹھہری، جرائم کے اُصولوں کی طرح

ریت کو آبِ بقا زہر کو نوشینہ کہو
خرِ پالنگ کو شبدیز کا ثانی سمجھو
سیج کو فرسودہ کہو گفتہ کو ناگفتہ کہو
پائے طاؤس کو نقّاشیِ مانی سمجھو
چاند کو داغ کہو، مہر کو انگارہ کہو
سحرِ و شام کو پریوں کی کہانی سمجھو

تم لطافت کی دُکاں کھول کے بیٹھے ہو کہاں
جنس نایاب سہی کوئی خریدار بھی ہو
کس کو دِکھلاتے ہو پیمانۂ گُل کی سُرخی
کور چشم اور بھلا خواہشِ دیدار بھی ہو!
نغمہ پیرائی ہے تسلیم مگر گوش کہاں
قدرِ عیسیٰ ہے سلامت کوئی بیمار بھی ہو

تم کو آدابِ جہاں آئیں تو کب آئیں گے
شاعری، سادہ دلی، بے خبری کچھ بھی نہیں
یہ جہاں ایک کمیں گاہ ہے، فردوس نہیں
حُسنِ ظن کچھ بھی نہیں خوش نظری کچھ بھی نہیں
جانبِ پُشت بھی دیکھا کرو گاہے گاہے
ایک منزل ہے مگر ہم سفری کچھ بھی نہیں

○

○

سُن کر بیانِ درد کلیجہ دہل نہ جائے
دُنیا سے ڈر رہے تھے کہ دُنیا بدل نہ جائے

ہر محفلِ نشاط سے پھرتا ہوں دُور دُور
کیا احتیاط ہے کہ ترا غم بہل نہ جائے

تُو آج تک تو ہے مری نظروں میں ہُو بہو
دُنیا بدل گئی تری صورت بدل نہ جائے

ہیں طاقِ آرزو پہ کھلونے سجے ہُوئے
مایوسِ آرزو کی طبیعت مچل نہ جائے

تشنہ لبی کہیں مجھے غرقاب کر نہ دے
تھوڑی سی روشنی کے لئے گھر ہی جل نہ جائے

اک خوف ہے کہ منزلِ نسیاں قریب ہے
تو وادیِ خیال سے آگے نکل نہ جائے

روؤں کہاں کہ راحتِ خلوت نہیں ہے شاذؔ
ہنسنے پہ بھی یہ شرط کہ آنسو نکل نہ جائے

○

رُخِ حیات کسی سمت موڑ دے کوئی
خُدا کرے مری یادوں کو لُوٹ لے کوئی

وہ حُسن رہا تھا خُدائے کریم کے مانند
مرا یہ حال کہ جیسے دُعا کرے کوئی

خوشی کے دن نہ تھے قُدرت مذاق کرتی تھی
تمام عُمر کے رونے کو کیا کہے کوئی

نہ پوچھ کیسی لگی شہرِ غم کی آب و ہوا
اُٹھا رہا ہے ترے ہجر کے مزے کوئی

کوئی نہیں تو مجھے شعر کا سہارا ہے
کہ بات کرتا ہو جیسے قریب سے کوئی

نہ میرا ذکر کہیں ہو نہ میں نظر آؤں،
خراب ہو کے محبت میں کیا کرے کوئی

تُو جا رہا ہے تو، آ ایک بار مِلتا جا
کہ عُمر بھر کی تمنّا تو سونپ دے کوئی

میں سوچتا تھا مرا حال تجھ پہ روشن ہے
کس اعتماد سے تکتا رہا تجھے کوئی

وفا کی میں نے مگر اُس نے کیوں وفا کی شاذؔ
میں رو رہا ہوں مرے حال پہ ہنسے کوئی

بیداد

شام کے رنگ میں گھل جاتے ہیں گہرے سائے
پاس کے پیڑ سے گرتے ہیں سنہری پتّے
راہ گیروں کے قدم پڑتے ہیں
میرے احساس میں کہرام سا مچ جاتا ہے
زرد پتّوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں میں
وہ مجھے روکتی ہے
میں اُسے دیکھتا ہوں
خوں بہا جیسے طلب کرتا ہو، قاتل سے کوئی
جس طرح اندھے کنوئیں میں کوئی جھانکے ڈر جائے
وہ مجھے دیکھتی ہے
جیسے سُولی پہ لٹکتا ہوں میں
اور بس کہنے کو ہوں آخری خواہش اپنی

وہ مجھے دیکھتی ہے
اور میں فرطِ ندامت سے کھڑا ہوں چپ چاپ
پاس کے پیڑ سے گرتے ہیں سنہری پتّے
راہ گیروں کے قدم پڑتے ہیں
میرے احساس میں کہرام سا مچ جاتا ہے
زرد پتّوں کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں میں
وہ مجھے روکتی ہے
چند لمحوں کے لیے خامشی چھا جاتی ہے
دھیرے دھیرے وہ سُناتی ہے مجھے
اک کہانی کہ جو اب یاد نہیں
اور میں جس کو بُھلا بھی نہ سکا
زرد وادی وہ نشیب
سبز چوبی در و دیوار کا گھر
جس کی خاموش فضا
کسی گذرے ہوئے طوفاں کا پتہ دیتی ہے
کہتی جاتی ہے وہ زینو کے شب و روز کا حال
یوں چُھٹی مانگ سے افشاں اُس کی
جس طرح پُھول سے زیرہ جھڑ جائے
رات بھر جاگتی رہتی ہے ستاروں کی طرح
موم بتّی کی طرح روتی ہے

آنکھ لگ جاتی جب پچھلے پہر
صُبح دیتی ہے کِرن کی دستک
سورج آ آ کے پلٹ جاتا ہے
اب تو دن رات کا احساس کہاں ہے اُس کو
آج بھی آتی ہے بالوں کی سیہ لٹ رُخ پر
لیکن اب اس کو ہٹانے کے لئے
وہ کبھی ناز سے گردن کو جھٹکتی بھی نہیں
وہ کلائی کا گُداز
چوڑیاں جس میں پھنسی رہتی تھیں
اب یہ عالم ہے کہ ہاتھوں سے نکل پڑتی ہیں
جاگتی آنکھوں کے بھاری پن میں
ایک غم ہے جو رگِ جاں میں اُتر جاتا ہے
رُخ پہ ہیں ایسی نقاہت کے سلونے سائے
اِنکساری سے مشابہ کوئی شَے
کچھ ملنساری سے مِلتی جُلتی
سر بسر لُطف و کرم
ایک تصویر ہے سوندھے پن کی
ایک کیفیتِ بے نام ہے سر تا بہ قدم

میں ندامت سے کھڑا ہوں چُپ چاپ

وہ مجھے دیکھتی ہے
میں خلاؤں میں کہیں دُور تکے جاتا ہوں
زرد وادی وہ نشیب
سبز چوبی در و دیوار کا گھر
جس کی خاموش فضا
کسی گذرے ہوئے طُوفاں کا پتہ دیتی ہے

مجکو رہ رہ کے خیال آتا ہے
میں نے کیا ظلم کیا زینو پر
دل کہیں واقعی پتّھر تو نہیں
گو مری آنکھیں نم آلود ہیں لیکن دل میں
ایک ہلکی سی مسرّت کی کرن پاتا ہوں
آپ اپنے سے یہ کہتے ہوئے اِتراتا ہوں
لو چلو آج یہ دن بھی آیا
ناز اُٹھوانے کا ارماں نکلا
چاہے جانے کی تمنّا نکلی !!

○

خوف کا صحرا

کیا ہُوا شوقِ فضول

کیا ہوئی جرأتِ رندانہ مری

مجھ پہ کیوں ہنستی ہے تعمیرِ صنم خانہ میری

پھر کوئی بادِ جُنوں تیز کرے

آگہی ہے کہ چراغوں کو جلاتی ہی چلی جاتی ہے

دُور تک خوف کا صحرا نظر آتا ہے مجھے

اور اب سوچتا ہوں فکر کی اِس منزل میں

عِشق کیوں عقل کی دیوار سے سر ٹکرا کر

اپنے ماتھے سے لہو پونچھ کے ہنس پڑتا ہے

○

تضمین بر غزلِ غالب

نغمہ حریفِ سازِ عنادل نہیں رہا
سودا، شریکِ شورِ سلاسل نہیں رہا
نالہ، گدازِ درد کا حاصل نہیں رہا
"عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

تھا دوش پر ندامتِ ہستی لئے ہوئے
خوفِ عدم بہ وحشتِ ہستی لئے ہوئے
میں تھا جہاں میں تہمتِ ہستی لئے ہوئے
"جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا"

تنگ اور قیدِ زُلفِ گرہ گیر کر کہ میں
طرزِ دگر سے پھر مجھے زنجیر کر کہ میں
فرمانِ تازہ قتل کا تحریر کر کہ میں
"مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا"

ناز و نیازِ شوق کا قصہ دراز ہے
شیشہ نظر کا جلوہ کی مئے سے گداز ہے
کیا رنگ و نُورِ ظلمتِ ہستی کا راز ہے
"بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا"

رحلِ نظر پہ جیسے دھری ہے کتابِ حُسن
مستی فروش و نشّہ بہ قامت شبابِ حُسن
شبنم بدست و صُبح بہ پہلو گلابِ حُسن
"وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا"

تحریرِ عہدِ لطف و عطا مٹ گئی کہ یاں
تاثیرِ سوزِ حرفِ دُعا مٹ گئی کہ یاں
تہذیبِ عشق و جرم و سزا مٹ گئی کہ یاں
"دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ یاں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا"

ہم جانتے ہیں شاذ کہ ہے دیدہ ور اسدؔ
مانا کہ خوار و خستہ ہے بے بال و پر اسدؔ
گو ہے رہینِ گردشِ شام و سحر اسدؔ
"بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا"

○

تضمین بر غزلِ غالبؔ

اب بھلا کیا ذکر کیجیے کیا رہا کیا جل گیا
ہائے کیا کیا سازو برگِ عیشِ رفتہ جل گیا
صورتوں کا ذکر کیا آئینہ خانہ جل گیا
"دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابہ جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا"

کیا ہوئی زنجیرِ غم جھنکار تک باقی نہیں
اب کہاں سر پھوڑیئے دیوار تک باقی نہیں
کیا عمارت ڈھ گئی آثار تک باقی نہیں
"دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا"

سر تو ہے لیکن نہیں سودائے گیسوئے نگار
اک خرابہ حسرتوں کا ہے قطار اندر قطار
تاب و تب باقی نہیں گو یاد ہیں قصّے ہزار
"دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اِس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا"

○

تضمین بر غزلِ اقبالؒ

دلِ ازل میں جو تھا ذوقِ جستجو میں ہوں
تمام سازِ تمنّا تمام سوزِ دُروں
چُھپائے پھرتا ہوں سینہ میں قلزم و جیحوں
"وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جُنوں
خدا مجھے نفَسِ جبرئیل دے تو کہوں"

ہُنر فریفتہ ہی قیمتِ ہُنر دے گا
سکوتِ سنگ کہاں دادِ شیشہ گر دے گا
تہی پیالہ، تہی دست کیسے بھر دے گا
سِتارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں"

نگاہ کیا ہے نظاروں کی جانِ محبوبی
جنون کیا ہے شکیب و قرارِ ایوّبی
وجود کیا ہے عناصر کی عرش مندوبی
"حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں"

تمام پردہ ہیں وہ ذوقِ روشنی دے کر
ازل سے تا بہ ابد لطفِ تشنگی دے کر
جنوں کے ہاتھ میں قندیلِ آگہی دے کر
"عجب مزہ ہے مجھے لذّتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں"

فرازِ طورِ جنون و درازدستیِ شوق
متاعِ درد و سرشتِ وفا و ہستیِ شوق
گدازِ قلب و مئے ذات و خود پرستیِ شوق
"ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں"

ہے اپنے شوق کا احساس ابتدا سے مجھے
ملی ہے تابِ سُخن بامِ کبریا سے مجھے
ہزار ناز سے کہتا ہے یہ خُدا سے مجھے
"سبق ملا ہے یہ معراجِ مُصطفٰیؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردُوں"

طلوعِ جلوہ پسِ اوجِ بام ہے شاید
مئے کشیدہ لمحات خام ہے شاید
مسافتِ بشری چند گام ہے شاید
"یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں"

○

مثالِ شعلہ و شبنم رہا ہے آنکھوں میں
وہ ایک شخص جو کم کم رہا ہے آنکھوں میں

کبھی زیادہ کبھی کم رہا ہے آنکھوں میں
لہو کا سِلسلہ پیہم رہا ہے آنکھوں میں

نہ جانے کون سے عالم میں اُس کو دیکھا تھا
تمام عُمر وہ عالم رہا ہے آنکھوں میں

تری جُدائی میں تارے بجھے ہیں پلکوں پر
نکلتے چاند کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

عجب بناؤ ہے کچھ اُس کی چشمِ کم گو کا
کہ سیلِ آہ کوئی تھم رہا ہے آنکھوں میں

وہ چھُپ رہا ہے خود اپنی پناہِ مژگاں میں
بدن تمام مجسّم رہا ہے آنکھوں میں

ازل سے تا بہ ابد کوششِ جواب ہے شاذؔ
وہ اک سوال جو مُبہم رہا ہے آنکھوں میں

○

جانے والے تری تاکید پہ روؤں کہ ہنسوں
کہ ترے بعد میں اچھا بھی رہوں، خوش بھی رہوں

دلِ برباد کا کچھ دن سے تقاضا یہ ہے
غمگساروں سے بھی احوال چُھپائے رکھوں

نقشِ پا چھوڑے تھے ہم دونوں نے جن راہوں پر
میں وہاں جاؤں ذرا دیر کو ٹھہروں، رو دوں

ایک پہلو پہ گذرتی ہے مری عُمر کی رات
میرے اللہ کو معلوم ہے، کس حال میں ہوں

جاگتی آنکھوں نے دیکھی ہے تری شامِ وداع
نیند میں دیکھ لوں یہ کرب تو میں چیخ پڑوں

تو مرے واسطے بے مہریِ حالات نہ بن
تجھ سے ملنا ہے تو یوں مل کہ میں پہچان سکوں

شاذؔ جو جانے وہی جانے برابر کی یہ آگ
کم نہیں عشق سے کچھ حُسن کا اندازِ جنوں

○

شعلے ہیں زخمِ دل ہے مرے پاس چھین لے
صحرا نشینِ شہر سے بن باس، چھین لے

فانوسِ جاں کا شیشۂ دیوار توڑ دے
رقصاں ہے رنگِ شعلۂ احساس، چھین لے

دل کی زمیں پہ نصب ہیں کتبے، نکال پھینک
مٹی کے اِن گھروندوں سے انفاس، چھین لے

میں اپنا ریگ زارِ تمنا سمیٹ لوں،
تو مجھ سے اپنی سونپی ہوئی پیاس، چھین لے

انصاف کر، یہ روز کا جھگڑا چُکا بھی دے
آ، ایک بار آ کے مری آس، چھین لے

مصرِ وفا سے رونقِ بازار، چھین لی
یوسف کے پیرہن سے بھی بُو باس، چھین لے

تو خیریت سے ہو بھی تو یہ بیم و خوف کیوں
آتے ہیں جی میں سینکڑوں وسواس، چھین لے

○

جانے کیا قیمتِ اربابِ وفا ٹھہرے گی
میں اگر عرض کروں گا تو خطا ٹھہرے گی

نوکِ نشتر سے کِھلائی گئیں کلیاں کتنی
جانے اِس شہر کی کیا آب و ہوا ٹھہرے گی

رقصِ پروانہ کی گردش جو تھمے آخرِ شب
اہلِ محفل کے لئے یہ بھی ادا ٹھہرے گی

آج کے دَور میں ویرانے بھی تعمیر ہوئے
کل کی تہذیب خُدا جانیے کیا ٹھہرے گی

مُدّتوں بعد کسی بند دریچے کے قریب
کیا خبر تھی مری رفتار ذرا ٹھہرے گی

تیری آواز مرے واسطے صحرا کا سکوت
میری خاموشی رہ و رسمِ دُعا ٹھہرے گی

لوگ رہتے ہیں یہاں خالی مکانوں کی طرح
کس کے دروازہ پہ دستک کی صدا ٹھہرے گی

شاذؔ اُدھر خواب کے دریا پہ ملے گا کوئی
ایک پرچھائیں سرِ آبِ بُنا ٹھہرے گی

○

دُور تک دُھند لکا ہے دُور تک دُھواں دیکھوں
تو کہاں نظر آئے میں تجھے کہاں دیکھوں

نخلِ یاد کا سایہ پَر سمیٹ لیتا ہے
میں شکستہ پا کب تک راہِ رفتگاں دیکھوں

جاتے جاتے اُس نے کیا وسعتیں عطا کی ہیں
جس طرف نظر ڈالوں دشتِ بیکراں دیکھوں

رنگِ پیرہن کی یاد شعلۂ بدن کی یاد
جب تری جدائی میں صُبح کا سماں دیکھوں

میرا اور دُنیا کا پھر سے معرکہ ٹھہرے
پھر ترے تبسّم کی صُلح درمیاں دیکھوں

راہ بھُول بیٹھا ہوں آرزو کی بستی میں
وہ مکیں کہاں ہو گا کون سا مکاں دیکھوں

مجھ سے تنکے چُنوائے تیری جستجو ہائے
تو جہاں نہیں ہو گا میں وہاں وہاں دیکھوں

کچھ نہ کچھ تو اُس کو بھی یاد رہ گیا ہو گا
میں تو عُمر بھر شاید ایک ہی سماں دیکھوں

پھر سے دل دھڑک جائے پھر سے آنکھ بھر آئے
شاذؔ پھر سرِ راہے اُس کو ناگہاں دیکھوں

پیاس

ابھی رخصت ہوئے مِل بیٹھ کے ہنس بول کے تم
پھر وہی یاد وہی دید کی حسرت وہی پیاس
یہ مری کو بختی تنہائی یہ میرا بن باس

تم مرا راز ہو سانسوں میں بسو، دل میں رہو
تم مرا گیت ہو ہر ساز پہ گا لوں گا تمھیں
روز کھوتا ہوں مگر مہرِ جہاں تاب کی طرح
کہ دمِ صبح در و بام پہ پالوں گا تمھیں
اب جو دیکھوں گا تو بس دیکھتا رہ جاؤں گا
اب ملو گے تو نگاہوں میں چھپا لوں گا تمھیں

جانِ شاعر تمھیں اب تک نہیں دیکھا میں نے
آنکھ بھر کر تمھیں اب تک نہیں دیکھا میں نے
ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے یہ ممکن بھی نہ تھا

○

نکہتِ آسودہ

لمس کی آنچ سے ہر پور میں مہکار سی ہے
گردشِ خوں ہے کہ شریانوں میں جھنکار سی ہے
آنکھیں جھکتی ہیں بہ افراطِ حجابِ دوشیں
شب کے پارے ہوئے کاجل کی چمک مدھم ہے
سخنِ زیرِ لب و قوسِ تبسم موہوم
احتیاط اتنی کہ کنگن کی کھنک مدھم ہے
چمپئی چھوٹ سی چھنتی ہوئی گھونگھٹ کے تلے
تیز ہے شعلۂ رُخ، دل کی کسک مدھم ہے
گُل کترتی ہوئی انگڑائی کی محرابِ دو نیم
شاخِ ہر عضو کے غنچوں کی چٹک مدھم ہے
کون جاگا ہے دمِ صبح سرِ بالشِ ناز
زُلفِ پُر پیچ و لباسِ شکن آلودہ لئے
موجِ انفاس میں اک نکہتِ آسودہ لئے

○

دائرہ

پلکیں نیندوں کے چنور، آنکھیں شبستاں کے چراغ
سخنِ زیرِ لبی، مُشک کے جھونکے جیسے
لفظ نوشنیہ تو لہجہ ہے شکر قند کی طرح
جملے اِس چاؤ سے پورے ہوں کہ وعدے جیسے
پیاس کی آنچ سے چٹخے نہ بدن کا بلّور
قوسِ ملبوس میں جلتے ہوں شوالے جیسے
ہر بُنِ مُو ہے ہم آغوشیِ پنہاں کی پُکار
تار کس دیں تو کھنک اُٹھتے ہوں پردے جیسے

اے دلِ زود فراموش خبر ہے کہ نہیں
زندگی آپ کو اِس طرح بھی دُہراتی ہے
کبھی نارنجی، کبھی سُرخ کبھی سبز قبا
وہی لڑکی ہے جو سو رنگ سے آجاتی ہے

○

○

میں تو چُپ تھا مگر اُس نے بھی سُنانے نہ دیا
غمِ دُنیا کا کوئی ذِکر تک آنے نہ دیا

اُس کا زہرابۂ پیکر ہے مری رگ رگ میں
اُس کی یادوں نے مگر ہاتھ لگانے نہ دیا

اُس نے دُوری کی بھی حد کھینچ رکھی ہے گویا
کچھ خیالات سے آگے مجھے جانے نہ دیا

بادباں اپنے سفینہ کا ذرا سی لیتے
وقت اتنا بھی زمانہ کی ہَوا نے نہ دیا

وہی انعام زمانہ سے جسے ملنا تھا
لوگ معصوم ہیں کہتے ہیں خُدا نے نہ دیا

کوئی فریاد کرے گونج مرے دل سے اُٹھی
موقعِ درد کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا

شاؔذ اک درد سے سو درد کے رشتے نکلے
کن مصائب نے اُسے جی سے بھلانے نہ دیا

○

نکہتِ گیسوئے جاناناں چلی آتی ہے
لاکھ پردوں سے حریفانہ چلی آتی ہے

درد جاگ اُٹھتا ہے سو سو طرح پہلو پہلو
یاد افسانہ در افسانہ چلی آتی ہے

حسرتِ دید ترے در پہ شفق کے ہمراہ
تو نے دیکھا ہے، گدایانہ چلی آتی ہے

آپ اپنے سے بنے کیا کہ ٹھنی ہے تجھ بن
آج تک سانس رقیبانہ چلی آتی ہے

اپنے دامن میں چھپائے ہوئے خاکسترِ طُور
آرزو دل میں کلیمانہ چلی آتی ہے

مر گیا ہوتا کوئی زیست کے سنّاٹے میں
اک صدا ہے کہ مسیحانہ چلی آتی ہے

صبح ہے یا کوئی ہمسایہ کی سرگوشی ہے
میرے گھر صورتِ بیگانہ چلی آتی ہے

فصلِ گُل کچھ بھی نہیں ظرفِ گلِ خاک سے شاذؔ
وہ تو ویرانہ بہ ویرانہ چلی آتی ہے

○

اُجالا چھن رہا ہے، روشنی تقسیم ہوتی ہے
تری آواز ہے، یا زندگی تقسیم ہوتی ہے

کبھی ریگِ رواں سے پیاس بجھ جاتی ہے رہرو کی
کبھی دریا کے ہاتھوں تشنگی تقسیم ہوتی ہے

یہی وہ موڑ ہے اپنے پرائے چھوٹ جاتے ہیں
قریبِ کوئے جاناں گمرہی تقسیم ہوتی ہے

خوشی کے نام پر آنکھوں میں آنسو آہی جاتے ہیں
بقدرِ غم محبّت میں خوشی تقسیم ہوتی ہے

یقیں آیا ترے شاداب پیکر کی کھنک سن کر
بدن کے زاویوں میں یوں ہنسی تقسیم ہوتی ہے

قیامت ہے دلوں کے درمیاں دیوار اُٹھاتے ہو
دِلوں کے درد کی ہمسائیگی تقسیم ہوتی ہے

وہیں کل وقت نے کھائی تھی ٹھوکر یاد ہے اب تک
وہ پیچ وخم جہاں تیری گلی تقسیم ہوتی ہے

سرِ پہنائے نغمہ شاذؔ کچھ شعلہ سا اُٹھتا ہے
سُنا ہے دولتِ پیغمبری تقسیم ہوتی ہے

○

سمٹ سمٹ سی گئی تھی زمیں کدھر جاتا
میں اُس کو بھولتا جاتا ہوں ورنہ مَر جاتا

میں اپنی راکھ کریدوں تو تیری یاد آئے
نہ آئی تیری صدا ورنہ میں بِکھر جاتا

تری خوشی نے مرا حوصلہ نہیں دیکھا
ارے میں اپنی محبّت سے بھی مُکر جاتا

کل اُس کے ساتھ ہی سب راستے روانہ ہوئے
میں آج گھر سے نکلتا تو کس کے گھر جاتا

میں کب سے ہاتھ میں کاسہ لئے کھڑا ہوں شاذؔ
اگر یہ زخم ہی ہوتا تو کب کا بَھر جاتا

○

ہر لفظ پگھلنے لگتا ہے ہر سانس دُعا ہو جاتی ہے
بے فیض نہیں ہے صحبتِ غم فطرت پہ جلا ہو جاتی ہے

ہم سادہ دلی سے ملتے ہیں دُنیا کے غرورِ بے جا سے
ہر روز یہ دل پچھتاتا ہے، ہر روز خطا ہو جاتی ہے

وہ دن جو شام تک آتا ہے کیا کیا تنکے چنواتا ہے
وہ شب جو سحر تک آتی ہے پچھلے کو بلا ہو جاتی ہے

کیا شے ہے مسلسل دُوری بھی رنجوری بھی، مجبوری بھی
افسردگیِ جاں قسمت پر راضی بہ رضا ہو جاتی ہے

پیاسے کے قدم لے دریا بھی دیوانے سے لپٹے صحرا بھی
یہ ضد جب پوری ہو نہ سکے شاعر کی اَنا ہو جاتی ہے

جینا بھی حقیقت ہو کہ نہ ہو، مرنا بھی صداقت ہو کہ نہ ہو
اک جُرم ہے ثابت ہو کہ نہ ہو، ہونی ہے سزا ہو جاتی ہے

کچھ اِس کا یقیں ہے شاذؔ مجھے جس شے کو چھولوں بول اُٹھے
تنہائی میں اکثر رات گئے کچھ ایسی فضا ہو جاتی ہے

کُتب خانہ

شق ہوا سینۂ گیتی کہ خزینہ نکلے
حکمت و فلسفہ و علم کا زینہ نکلے
ذرّۂ خاک بھی مانندِ نگینہ نکلے
ہر خزف ریزہ یہاں مہر کا سینہ نکلے
ہر سُتوں روشنی و رنگ کا افسانہ ہو
نُورِ خورشید پہ بنیادِ کتب خانہ ہو

انوار العلوم ایوننگ کالج کے کتب خانہ کی تقریبِ سنگِ بنیاد کے موقع پر

آنکھ کو زاویۂ فکر و نظر کس نے دیا
لب کو اعجازِ مسیحا و خضر کس نے دیا
ذہن کو جادۂ پُرپیچ و خطر کس نے دیا
شوق کو حوصلۂ فتحِ قمر کس نے دیا
ہاں یہیں پرورشِ لوح و قلم ہوتی ہے
کھینچیے قشقہ کہ تعمیرِ صنم ہوتی ہے

○

عِلم، ظلمات میں ہے آبِ بقا کے مانند
عِلم، تنویرِ عبادت ہے دُعا کے مانند
عِلم ہے تکملۂ حُسنِ ادا کے مانند
عِلم سرتا بقدم نُور، خُدا کے مانند
عِلم جب فکر کی میزان میں تُل جاتا ہے
درِ ہفت آسماں اک آن میں کُھل جاتا ہے

○

علم صیقل گرِ اوہام و گماں ہے کہ جو تھا
علم، آوازۂ پہنائے زماں ہے کہ جو تھا
علم، اندوختۂ دل زدگاں ہے کہ جو تھا
علم، تمیزِ من و تُو کا بیاں ہے کہ جو تھا
عِلم ہر جادۂ پُر پیچ پہ طاقت ٹھہرے
عِلم گر ہو تو بصارت بھی بصیرت ٹھہرے

○

آگہی چاہیے اَوراقِ مصوّر ہیں یہاں
ہر ورق آئینۂ شش جہت و سِرّ نہاں
ہر کتاب ایک جہاں دیدۂ بینا کی دُکاں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں الفاظ معانی کے مکاں
تہ نشیں ہو، دُرِ نایاب نکالے کوئی
قطرہ کہتا ہے کہ دریا کو کھنگالے کوئی

○

بام و در کہتے ہیں آ، ہم ترا دامن بھر دیں
شرر و شعلہ و سیماب سے تن من بھر دیں
بجلیوں سے ترے احساس کا ایمن بھر دیں
گُلِ تازہ سے تری فکر کا گلشن بھر دیں
طَلبِ علم میں اِس در سے سوالی نہ پھرے
جس نے آواز لگائی ہے وہ خالی نہ پھرے

○

انگلیاں بُنتی ہیں وجدان کے ہالے کیا کیا
پیاس بھڑکائیں گے امرت کے پیالے کیا کیا
دل کُشا خواب ہیں تعبیر کے پالے کیا کیا
اِس در و بام میں اُتریں گے اُجالے کیا کیا
وہی تصویریں کہ دیکھا ہے جنھیں خوابوں میں
حُوریں رقصندہ ہیں الہام کی محرابوں میں

○

ہر دریچہ میں ہو یوں شعلۂ ادراک کی لَو
رُخ کو روشن کرے جیسے نگہِ پاک کی لَو
جام میں جیسے ڈھلے خونِ رگِ تاک کی لَو
جیسے فانوسِ بدن میں دلِ صد چاک کی لَو
آگ روشن رہے بت خانۂ فارس کی طرح
چھُونے والا ہو تو ہر سنگ ہے پارس کی طرح

○

یہ عمارت رہے اک جلوہ گہِ نازشِ فن
آفریں باد بریں قسمتِ خشت و آہن
دُور تک دیدنی ہے شعلۂ گُل ہائے زمن
سنبل و نسترن و لالہ و ریحان و سمن
آج ہم حوصلۂ سیرِ چمن رکھتے ہیں
آنسوؤں کے لئے بُنیادِ خُتن رکھتے ہیں

○

تہذیبِ وفا!

اب بھلا ذکر ہی کیا تیری جُدائی کیا ہے
میں تو روتا ہوں کہ تہذیبِ وفا ختم ہوئی

ڈر رہا ہوں کہ زمیں زیرِ قدم ہے کہ نہیں
جیسے مجھ پر کششِ ارض و سما ختم ہوئی

شورِ دُنیا ہے کہ پرچھائیاں سنّاٹے کی
لب ہلا کرتے ہیں آواز نہیں آتی ہے
جانے کیا ہو گیا دُکھ سُکھ کا مزہ یکساں ہے
جیسے ہر شے مرا معمول ہوئی جاتی ہے
ایک دھاگے سے بندھی ہو مری دُنیا جیسے
کس گراں باریٔ احساس سے تھرّاتی ہے
کون مندر سے چُرائے گیا سب بُت میرے
روح ناقوس کی فریاد پہ گھبراتی ہے
ہائے کس سمت گیا میرا خدا کعبہ سے
پنکھڑی جیسی دُعا بن کھلے مُرجھاتی ہے

آبِ موتی سے گئی رنگ گلوں سے چھوٹا
عکسِ آئینہ گیا دھوپ کے سائے بدلے
رُخِ مہتاب بجھا سینۂ شب سرد ہوا
درد چُپ ہو گیا، آہوں کے قرینے بدلے
کتنے خوش رنگ خیالوں کی نقابیں اُتریں
دیکھتے دیکھتے دیکھے ہوئے چہرے بدلے
یہ سزا کیا ہے، جزا کیا ہے، سمجھائے کوئی
کوئی آئے مری قسمت کے نوشتے بدلے
نیک و بد کیا ہے، بھلا کیا ہے ثواب و عصیاں
کیسا ایمان گیا، کیسے عقیدے بدلے

اب بھلا ذکر ہی کیا تیری جدائی کیا ہے — میں تو روتا ہوں کہ تہذیبِ وفا ختم ہوئی
ڈر رہا ہوں کہ زمیں زیرِ قدم ہے کہ نہیں — جیسے مجھ پر کششِ ارض و سما ختم ہوئی

○

اب یہ طے کر کے چلو!

اب یہ طے کر کے چلو کوئی کسی کا نہ رہے

کوئی پشتارۂ نیکی کہ گناہوں کی کتاب
عرصۂ حشر ہے یہ، صاف رکھیں اپنا حساب
پابرہنہ، نظر افگار، پریشان رہیں
ناقۂ عمرِ دو روزہ کے نگہبان رہیں

اب یہ طے کر کے چلو کوئی تمنّا نہ رہے

گوشۂ دل یونہی رہتا ہے تو خالی رہ جائے
کسی پتّھر کے تلے دستِ سوالی رہ جائے
ہونٹ جلتے رہیں فریاد نہ آنے پائے
اپنی اپنی بھی ہمیں یاد نہ آنے پائے

اب یہ طے کر کے چلو صبر کا یارا نہ رہے

اپنی تنہائی سے لپٹیں تو کلیجہ پھٹ جائے
کسی غم خوار کو ترسیں تو ترستے ہی رہیں
دشتِ نو میدیٔ جاوید میں سائے کے لئے
ایک دیوار کو ترسیں تو ترستے ہی رہیں

اب یہ طے کر کے چلو کوئی شناسا نہ رہے

درد کے معرکۂ شوق نے دی رُسوائی
بانٹ لیں مالِ غنیمت کی طرح تنہائی
میں رکھوں اشک تمہیں اشکوں کی تابانی دوں
میرے حصّہ میں کھٹکتی ہوئی یادیں رہ جائیں
اور تمہیں زود فراموشی کی آسانی دوں

○

○

پھر وحشتِ وفا لَو دینے لگا بھولے ہوئے غم پھر یاد آئے
جو ریگِ رواں میں ڈوب گئے وہ سائے مسافر یاد آئے

کچھ رنگ تھے ہلکے گہرے سے پرچھائیاں تھیں یا چہرے سے
وہ لوگ نہ جانے اب ہیں کہاں جو تیری خاطر یاد آئے

سنّاٹے کے نوحے سنتا ہوں خاموشی کے ہالے بُنتا ہوں
دیوانوں کی جب بھی یاد آئی ویرانے بظاہر یاد آئے

پھر شام کی پلکیں جُھکنے لگیں میداں کی سانسیں رُکنے لگیں
بستی سے جو واپس آ نہ سکے جنگل کے وہ طائر یاد آئے

اُفتادہ زمیں، قدموں کے نشاں، سُنسان مکاں پچھلے کا دھُواں
شناسا اُن کا نہ تھا کچھ ذکر یہاں کس طرح وہ آخر یاد آئے

○

پھر ترا درد تری آس کہاں سے لاؤں
ایک نشترِ پسِ انفاس کہاں سے لاؤں

تو ز سرتا بقدم جوئے خنک آب سہی
زہر سیراب ہوں میں، پیاس کہاں سے لاؤں

ہونٹ جلتے تھے بہ ہنگامِ سخن تیرے حضور
آج وہ شدّتِ احساس کہاں سے لاؤں

مجھ سے کچھ مانگنے آئی تھی شبِ رفتہ مری
اب شبِ رفتہ ترے پاس، کہاں سے لاؤں

شاذؔ وہ گمشدگی سب سے جدا سب سے الگ
ہائے وہ سلسلۂ یاس کہاں سے لاؤں

○

ہم لاکھ کچھ کہیں بھی تو کیا مانتے ہیں لوگ
یوں کھُل کے مت ملو کہ بُرا مانتے ہیں لوگ

ہر صُبح سب سے پوچھتے پھرتے ہیں ہم کہ آج
بندے ہیں کون ؟ کس کو خُدا مانتے ہیں لوگ

دیکھا ہے جن کو، خیر سے، گردانتے نہیں
دیکھا جنھیں نہیں ہے، سُنا مانتے ہیں لوگ

اِس دَور میں حیات کا مفہوم جان کر
ناچار ہو کے اپنی خطا مانتے ہیں لوگ

کچھ اِس طرح ہیں ہم بھی، دخیلِ مزاجِ دہر
اک حیلۂ سُخن ہے، ذرا مانتے ہیں لوگ

کونپل کے پھُوٹنے کی کھنک کیا سُناؤں میں
اس شہر میں تو لُو کو صبا مانتے ہیں لوگ

سمجھے گا کون رُوپ کی جھنکار کیا ہے شاذؔ
کب رنگ کو فسونِ نوا مانتے ہیں لوگ

○

مانا کہ میرے ظرف سے بڑھ کر مجھے نہ دو
شبنم ہی مانگتا ہوں سمندر مجھے نہ دو

جس کو ہوا کے رُخ پہ نہ کھولا گیا کبھی
اک ایسے بادباں کا مقدّر مجھے نہ دو

دیوار جس کی سرحدِ صحرا سے جا ملے
ایسی سزائے خانۂ بے در مجھے نہ دو

لَو دے رہی ہے سوچ کے وقفہ کی خامشی
ہر بات کا جواب سنبھل کر مجھے نہ دو

کچھ دے سکو اگر تو کوئی خواب سونپ دو
سایہ تلاش کرتا ہوں، پیکر مجھے نہ دو

میں آپ اپنے جرم و سزا کا حریف ہوں
الزامِ شوق سب کے برابر مجھے نہ دو

گر سُن سکو تو شاذؔ کی خاموشیاں سُنو!
تکلیفِ عرضِ حال مُکرّر مجھے نہ دو

○

تیرے بغیر صورتِ گردابِ جاں ہوں میں
اک بادبانِ کشتیِ ریگِ رواں ہوں میں

اِس زندگی کو ٹوٹ کے چاہا ہے آج تک
یک طرفہ دوستی سے مگر بدگماں ہوں میں

کچھ اِس طرح ہے گنجِ سخن میں مری مثال
شبنم کے آئینے پہ سحر کا دُھواں ہوں میں

دستک کی آس، چاپ کا ارماں، اُداس رات
کوئی خرامِ سایہ کہ خالی مکاں ہوں میں

میں تشنہ کام شاخِ سرِ آب کھو گیا
اب ریگِ نم پہ قدموں کا جیسے نشاں ہوں میں

○

یہ نیم شب کی نرم آنچ پھول بن سے آئی ہے
سواری ماہتاب کی کِرن کِرن سے آئی ہے

مری نوائے شوق کی یہ دُھوپ چھاؤں دیکھنا
کہ دشت دشت گھوم کر چمن چمن سے آئی ہے

یہ درد و غم کی فرصتیں یہ عُمر بھر کی خَلوتیں
خراب ہو کے زندگی اک انجمن سے آئی ہے

وہ ابتدائے عِشق کے تکلفات اُٹھ گئے
وہ آج گھر کے سیدھے سادے پیرہن سے آئی ہے

مرا جمالِ فکر ہے ربوبیت لئے ہوئے
مگر وہ خوئے سرکشی جو اہرمن سے آئی ہے

سکوتِ شہرِ خواب پر صدا کے زخم آئے ہیں
یہ دھار میرے شعر پر خلوصِ فن سے آئی ہے

وہ سنگ ہو کہ آدمی ذرا تراش لے کوئی
کہ صنعتِ خیال دستِ تیشہ زن سے آئی ہے

تو بن چھوئی کلی سہی سُنی ہے جب ہنسی تری
تو نکہتِ وصال تیرے تن بدن سے آئی ہے

دمِ سحر وہ نازنیں ہے شادؔ سُرخ و شرمگیں
شگفتگی یونہی نہیں یہ سب تھکن سے آئی ہے

موج و ساحل سے مِلو

دُھن پر لکھا ہوا ایک نغمہ :

موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو
سب سے مل آؤ تو اک بار مرے دل سے مِلو

دلِ برباد نے کیا ٹوٹ کے چاہا ہے تمھیں
کس قدر پیار سے مرمر کے تراشا ہے تمھیں
جب بھی دیکھا ہے اُسی شوق سے دیکھا ہے تمھیں
سر جُھکایا ہے، خُدا مانا ہے، پُوجا ہے تمھیں
رنگ و عشرت سے مِلو
عیش و راحت سے مِلو
نُور و نکہت سے مِلو
سب سے فرصت سے مِلو
سب سے مل آؤ تو اک بار مرے دل سے مِلو
موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو

تم مرے ہونٹوں پہ رہتی ہو دُعاؤں کی طرح
کتنی معصوم ہو تم میری وفاؤں کی طرح
دُور ہی دُور ہو جنگل کی ہواؤں کی طرح
تم چلی آؤ شرابور گھٹاؤں کی طرح

سبزہ زاروں سے ملو
نو بہاروں سے ملو
شوخ دھاروں سے ملو
تم ہزاروں سے ملو

سب سے مل آؤ تو اک بار مرے دل سے ملو
موج و ساحل سے ملو
مہِ کامل سے ملو

موجِ مے تم سے چھلکنے کی ادا مانگے ہے
پھول گلشن میں مہکنے کی ادا مانگے ہے
حُسن آنکھوں سے جھلکنے کی ادا مانگے ہے
درد کا چاند چمکنے کی ادا مانگے ہے

صبح سے شب سے مِلو
پیار سے ڈھب سے مِلو
ناز سے چھَب سے مِلو
شوق سے سب سے مِلو

سب سے مل آؤ تو اک بار مرے دل سے ملو
موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو

کیا کہوں دہر میں مجھ سا نہیں تنہا کوئی
تم پہ ظاہر ہے کہ تم سے نہیں پردہ کوئی
تم نہ آؤ تو نہیں میرا سہارا کوئی
آؤ اک بار کرو شاذؔ سے وعدہ کوئی

شبِ رعنا سے مِلو
صبحِ فردا سے مِلو
کیفِ صہبا سے مِلو
ایک دُنیا سے مِلو

سب سے مل آؤ تو اک بار مرے دل سے مِلو
موج و ساحل سے مِلو
مہِ کامل سے مِلو

ایک سوال

فسردہ شب ہے فلک پر سیاہ بادل ہیں
زمین شفقتِ مادر کا رُوپ دکھلائے
پپوٹے نیند سے ممتا کے جیسے بوجھل ہیں
ادھورے بول لبوں پر سہانی لوری کے
ٹھہرتی جاتی ہے جھولے کی پینگ دھیرے سے
کہ انگلیوں سے سِرے چھوٹتے ہیں ڈوری کے
مگر وہ طِفل جو روتا ہے کون سمجھائے

○

پچھلے پہر کی سیڑھیوں سے

پھر پچھلے پہر کی سیڑھیوں سے
اک گیت اُتر رہا ہے دیکھو
پھر زانوئے شاخ شاخ پر چاند
کس ناز سے مُڑ رہا ہے دیکھو

پُر شور ہوا، گھٹا، سمندر
دُھنکی ہوئی نَم فضا کا سونا
برفیلی سفید چوٹیوں پر
آہستہ خرام بہہ رہا ہے

شفّاف سُنہری وادیوں میں
پھُولوں سے ڈھکا ہوا دریچہ
دروازۂ نیم باز کب سے
اک چاپ کا درد سہہ رہا ہے

محراب میں آگ جل رہی ہے
لب بستہ شکستہ وائلن پر
رقصندہ ہیں ناشنیدہ تانیں
یہ شخص ہے کون؟ نام کیا ہے
بکھرے ہوئے بال اُداس آنکھیں
پتّھر کا کوئی مجسّمہ ہے
اک نغمۂ بے صدا ہے لرزاں
سنّاٹا یہ کس سے کہہ رہا ہے
اب میرے تمہارے راستے میں
کچھ بھی تو نہیں بجز سمندر
میں پار کہاں اُتر سکوں گا
تم آنہ سکو گی مجھ تک اُڑ کر
انفاس کا رہ گیا ہے رشتہ
اس جاتی ہوئی بہارِ جاں سے
اک آخری پھول اور چُن لو
میں اپنی تمام کشتیوں کو
ساحل پہ جلا رہا ہوں سُن لو

○

○

آباد کب تھا، کیوں اُس نے لُوٹا
اِس دل کا کیا ہے لُٹا تو لُوٹا

یا کوئی آنسو دامن پہ ٹپکا
یا کوئی قیدی زنداں سے چھُوٹا

ہے کون زیور اُس کے برابر
سادہ لباسی گُل ہے نہ بُوٹا

میلے میں گُم ہے اک طفلِ ارماں
کس کا نہ جانے کب ہاتھ چھُوٹا

دُنیا ہے رنگیں مثلِ کفِ پا
ہر گام پر اک آبلہ پھُوٹا

حالات سچّے حالات جھُوٹے
کیا حُسن سچّا کیا عشق جھُوٹا

کیوں شاذؔ اتنے آزردہ کیوں ہو
آئینہ ٹوٹا یا عکس ٹوٹا

○

یوں پاسداریٔ دلِ زندہ کیا کرو
ہر اک حسین شے کی تمنا کیا کرو

سونے کی وادیوں کا سفر ہے تمہاری نیند
خوابوں کا انکھڑیوں سے تقاضا کیا کرو

پھولوں کی پتیوں سے گندھا ہے تمہارا جسم
تم ہر جگہ بہار کا چرچا کیا کرو

اٹھتے ہیں جن کی ٹیس سے نغماتِ سرمدی
وہ زخم بھر بھی جائیں تو پیدا کیا کرو

گنجِ سخن میں اڑتی ہیں ان دیکھی تتلیاں
شامِ خیال و خواب میں پیچھا کیا کرو

سب نرغۂ وجود میں ہیں کیا بچاؤ گے
آپ اپنی زندگی کا تماشہ کیا کرو

اس آنکھ سے تو صرف قسم کھاؤ پیار کی
اس منہ سے اور کچھ نہیں وعدہ کیا کرو

توفیقِ عشق شاذ بجز آگہی نہیں
ہر رنج سے نشاط کا سودا کیا کرو

○

جب میں بھی وہی چاہوں، جب تو بھی وہی چاہے
پھر غم کا سبب کیا ہے، کیوں رونے کو جی چاہے

یادوں کا تقاضا ہے تنہائی کی محفل ہو
محفل کی ہو تنہائی افسردہ دلی چاہے

شکوہ نہ اُلہنا ہے سُننا ہے نہ کہنا ہے
جو تیری رضا ٹھہرے جو تیری خوشی چاہے

آتش بہ رگِ جاں ہوں، وحشت بہ گریباں ہوں
صحرائے وفا اب تک آہستہ روی چاہے

کیا کیا غمِ دوراں ہے کیا کیا غمِ جاناں ہے
اب اے دلِ تنہا تو، کس کس کی خوشی چاہے

معیارِ وفا اُس نے ہر روز بدل ڈالا
اُس شوخ کا کیا کہنا ہر بات نئی چاہے

جاں تیری محبت کو کچھ اور سوا مانگے
دل تیری مروّت میں تھوڑی سی کمی چاہے

کیا ہو گیا شاذؔ آخر حیرت ہے کہ یہ تم ہو
کچھ تو ہے لگی دل کی، کیا دل کی لگی چاہے

○

کانپ جاتی ہے دل و جاں کی فضا شام کے بعد
رات کیوں آتی ہے اے میرے خُدا شام کے بعد

ضبط کا حوصلہ پاتے ہیں سحر کے ہمراہ
صبر ہو جاتا ہے پہلو سے جُدا شام کے بعد

زخم روشن نظر آتے ہیں ستاروں کی طرح
کیسی ملتی ہے محبّت کی سزا شام کے بعد

کوئی غم خوار کوئی پوچھنے والا ہی نہیں!
ہم بھی ہو جاتے ہیں اپنے سے خفا شام کے بعد

کوئی چھُپ چھُپ کے بُلاتا ہے ذرا غور سے سُن
دل کے ویرانے سے آتی ہے صَدا شام کے بعد

طاقِ اُمید پہ خاموش ہے وعدہ کا چراغ
دلِ برباد کا کوئی نہ رہا شام کے بعد

شاؔذ پھر اُس سے مُلاقات کی حسرت جاگی
خود بخود ہونٹوں پہ آتی ہے دُعا شام کے بعد

○

آج حضورِ یار ہم عرضِ وصال لے چلے
وہم وگماں کی خیر ہو خواب وخیال لے چلے

عکسِ رُخِ بہار ہم آئینۂ نگار ہم
اپنی نگاہ میں ترا حُسن و جمال لے چلے

زخم دِکھانے آج ہم شمع جلانے آج ہم
تجھ کو سُنانے آج ہم صورتِ حال لے چلے

ضبط کیا ہے عُمر بھر کون کرے گا یوں بسر
اپنی مثال ہی نہ تھی اپنی مثال لے چلے

صُبحِ ازل سے شاذؔ ہم مانگ کے لائے شامِ غم
جس کا جواب ہی نہیں ایسا سوال لے چلے

○

کوئی گلہ، کوئی شکوہ ذرا رہے تم سے
یہ آرزو ہے کہ اک سلسلہ رہے تم سے

اب ایک دن کی جُدائی بھی سہہ نہیں سکتے
جُدا رہے ہیں تو برسوں جُدا رہے تم سے

فقط یہ بات کہ تم سے بڑی اُمیدیں ہیں
خفا نہ ہونا اگر ہم خفا رہے تم سے

قدم قدم پہ کوئی آرزو کی راہوں میں
ٹھہر کے اپنا پتہ پُوچھتا رہے تم سے

تمہارے نام سے منسوب ہو گئی ہے غزل
نگارِ فن کا مقدّر بنا رہے تم سے

تمہارے غم سے ہمیں کتنے کام باقی ہیں
تمام عُمر یونہی جی لگا رہے تم سے

ہر ایک شخص کی ہوتی ہے اپنی مجبوری
میں اُس جگہ ہوں جہاں فاصلہ رہے تم سے

ہمارے عشق کی بنیاد ہے فراق پہ شاذؔ
خدا کرے کہ یہ نکتہ چھپا رہے تم سے

تجدیدِ رسم و راہ

تجدیدِ رسم و راہ کی یہ رُت یہ ابر و باد
داغوں کی بُھولی بِسری چمک یاد آ گئی
آنسو کی دُھند، یاد کے جگنو، طویل سوچ
بیتے ہوئے دِنوں کی جھلک یاد آ گئی
پہلو میں تھیں دبی ہوئی چوٹیں اُبھر گئیں
ٹوٹے ہوئے دِلوں کی کھنک یاد آ گئی
وہ چاؤ وہ سبھاؤ وہ چھل بل وہ رُوپ رنگ
وہ بانکپن وہ نوکِ پلک یاد آ گئی
پیماں کی بیلیں پاؤں سے آ کر لپٹ گئیں
وعدوں کے پھول بن کی مہک یاد آ گئی

اب زینۂ شعور پہ ہم مُدّتوں کے بعد
ہشیار بن کے یوں ملے ناوانیاں گئیں

طے کر کے جیسے بیٹھے ہوں دل کے معاملات
سود و زیاں کی فکر، گراں جانیاں گئیں
اب اپنے اپنے جینے کی ہیں مشکلیں بہت
یا وِشِ بخیر مرنے کی آسانیاں گئیں
دل ڈوبتا تھا رخصتِ نجم سحر کے ساتھ
پہلی کرن کے دکھ کی پریشانیاں گئیں
کیا دَور تھا خدا کو مناتے رہے تھے ہم
دل سے دعا کی بے سر و سامانیاں گئیں

اب قربتیں کہ فاصلے زیرِ نگیں تو ہیں
پانے کی آس ہے نہ بچھڑنے کا خوف ہے
اب زخم ہی نہیں تو جراحت کا ذکر کیا
ٹانکا کوئی رہے تو ادھڑنے کا خوف ہے
کب رُوح کے کھنڈر میں ہے پرچھائیوں کی چاپ
کب دل کی بستیوں کے اُجڑنے کا خوف ہے
اب بازیٔ وفا میں کوئی ہار جیت کیا
اب کس کو جاں کا کھیل بگڑنے کا خوف ہے
اب اک جہاں کے ناز اُٹھائیں تو کس لئے
پالا کہاں اُمید سے پڑنے کا خوف ہے

ہم نے گذار دیں کئی راتیں جُدا جُدا
اَن جانی کب رہی ہیں بدن کی سیاحتیں

تھی لمس کے خیال سے رگ رگ پھُنکی ہوئی
اب جزوِ دلبری ہیں لہو کی حرارتیں

پہلو کی آنچ جسم کا تنوّر، لب کی آگ
میری بھی راحتیں ہیں، تمہاری بھی راحتیں

اب رسمیاتِ رفتہ کا موسم نہیں رہا
اب اعتبارِ درد ہیں اپنی رفاقتیں

دامِ وصال و ہجر سے بچ کر نکل چلیں
آؤ ہمیں پُکار رہی ہیں محبتیں

○

مآل

کل میں تمہارے دَر سے چلا تھا
کیسے کیسے تحفے لے کر
پُھول سی باتیں، چھیڑ، لطیفے
شوخ ہنسی، سرگوشی، فقرے
اِدھر اُدھر کے قصّے لے کر
کل میں تمہارے دَر سے چلا تھا

○

رات ڈھلی، پَو پھوٹ رہی ہے
کیوں یہ اچانک آنکھ کُھلی ہے
گہرے دُکھ کے خیال آتے ہیں
دید کی ساعت وصل کے لمحے
آنسو کیسے بن جاتے ہیں

○

○

تُو، چھوڑ کر ہمیں اِس طرح کل گیا ہے میاں
ہمارا شہر تو کیا دشت جل گیا ہے میاں

ہمیں پتہ ہے کڑی دُھوپ کا سفر کیا ہے
ہمارے سر سے تو سورج بھی ڈھل گیا ہے میاں

ہوائے کُنج میں کچھ بُوئے خوں سی آتی ہے
کوئی تو پُھول کی پتّی مَسل گیا ہے میاں

یہ لوگ کون ہیں! یہ بستیاں اُداس ہیں کیوں
یہ کون خاک سی چہروں پہ مَل گیا ہے میاں

نہ ہم ہیں دشت مکیں اور نہ تُو ہے پردہ نشیں
وصال و ہجر کا موسم بدل گیا ہے میاں

نذرِ جاں نثار اختر

بدل سکو تو بدل دو فغاں کی لَے اپنی
زمانہ دوسری کروٹ بدل گیا ہے میاں

تمھاری پیاس کو شبنم کا آسرا تو ملا
ہمارے کھیت سے بادل کا دَل گیا ہے میاں

وہ "تم" کہاں ہے یہ کیوں "آپ آپ" کہتے ہو
کہ یہ "تپاکِ شریفانہ" کھَل گیا ہے میاں

وہ اتنی دُور ہمیں چھوڑ کر گیا، ہی نہ تھا
کہ یوں بھی دُکھ ہے کہ پہلے بہل گیا ہے میاں

چھُپائے رکھا تھا اک خواب اپنی آنکھوں میں
گذشتہ رات وہ نیندوں میں جل گیا ہے میاں

وہ اشک تھا، کوئی ارماں تھا، جانے کیا تھا شاذ
کھٹک رہا تھا جو کانٹا نکل گیا ہے میاں

پچھلے پہر کا سفیر

وہ بکھرے بال، وہ آنکھوں کی سوچتی ہوئی لَو
وہ بے نیاز تبسّم تھکی تھکی آواز
میں ڈھونڈھ لاتا اُسے وہ اگر کہیں ہوتا
عجب نہیں وہ پلٹ آئے پھر سے صورتِ راز
میں جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا

صدا نہیں ہے، عروس البلاد چُپ کیوں ہے
وہ سیڑھیاں، وہ در و بام سر جُھکائے ہوئے
دریچے جیسے سرِ شام لَو بُجھائے ہوئے
کسی کے در پہ کوئی نامُراد چُپ کیوں ہے
مکاں پکارتا شائد اگر مکیں ہوتا

تمام شورشِ ہستی سکوت ہے گویا
حیات کچھ نہیں، سنّاٹا جیسے بات کرے
اِدھر بھی گھور اندھیرا، اُدھر بھی تاریکی
کرے تو بس کوئی ذکرِ توہّمات کرے
لگا رہا مجھے کھٹکا تری جُدائی کا
فقط گُماں تھا، گُماں کا کسے یقیں ہوتا

عدم سے تا بہ عدم روشنی کے وقفے میں
اَجل اَٹل ہے مگر زندگی کے وقفے میں
دخیلِ ہر نفسِ آرزو، اَجل کیوں ہے
بہ نوکِ خار قریبِ گلُو، اَجل کیوں ہے
الٰہی خیر ہو، کیا قہر، کیا تماشہ ہے
یہ تجھ سے پوچھتا، سب کیا ہے تیری ایما ہے
اگر میں خضر و مسیحا کا ہم نشیں ہوتا

میں چاروں اور بڑی حسرتوں سے تکتا ہوں
کوئی تو چھب نظر آجائے گی کہیں نہ کہیں
نہ آئینہ میں ترے عکس کی امانت ہے
نہ دائروں میں بھنور کے، تری شباہت ہے
نہ تیرے سائے کا پیکر، تراش سکتا ہوں
تُو سو رہا ہے جہاں خُوش نصیب ہے وہ زمیں
خیال آتا ہے اے کاش میں زمیں ہوتا

○

کوئلیا مت کر پکار

وہ سُر کی جھیل وہ آواز کے کنول کی دمک
الاپ تھی کہ کلیجہ کی کور کٹتی تھی
گداز تان میں کومل کی ست رنگی سج دھج
گُلال اُڑتا تھا، سینہ میں پَو سی پھٹتی تھی

وہ اُنگلیوں کا تسلسل رسیلے تاروں پر
کہ پَرنیاں پہ رواں موتیوں کے فوّارے
طلوع ہوتے ہوئے چاند ہالہ در ہالہ
وہ گنگا جمنی، وہ جِھل مِل وہ ریشمے دھارے
وہ صحنِ جاں کے گلابوں سے رنگ چھنتے ہوئے
وہ کُنجِ رُوح میں شبنم بہ دست انگارے
غزل چھڑے تو کئی چہرے یاد آتے تھے
چلے گئے وہ نگارانِ خوب رُو سارے

(بیگم اختر کی یاد میں)

ہے محوِ خواب گُلِ نغمہ، زیرِ پردۂ ساز
لبِ خموش پہ سرگم کے بول گریہ کُناں
دِلوں کے راز کی گرہیں اُلجھتی جاتی ہیں
کہ مِٹ چلا ہے کسی ناخنِ نوا کا نشاں
شکستِ لحن پہ ہے سُرمہ در گلو مضراب
اُداس اُداس ہے لَے، نَے سے اُٹھ رہا ہے دھُواں
برہنہ پا ہیں کھرج، تال، سَم، رکھب، گندھار
کھڑی ہوئی ہیں کھُلے سر تمام راگنیاں
ہے آج چرخِ ترنّم سے رخصتِ ناہید
کہ کل سے بند رہے گا سرسوتی کا مکاں

○

جب نام ترا لیجئے

زمانہ زُود فراموش ہے بہت لیکن
تجھے بُھلانے کو رونا پڑے گا برسوں تک
نہ جانے کون سی شئے تھی جسے گنوا بیٹھے
نہ جانے کیا ابھی کھونا پڑے گا برسوں تک

کہا یہ سُن کے مرے غم گُسار نے مجھ سے

کوئی بھی زخم ہو بھر جائے گا کبھی نہ کبھی
جو بات آج ہے وہ کل نہیں ہے یادوں میں
چمک چمک کے بُجھے گا ہر اک ستارۂ درد
کوئی خلش ہو مُسلسل نہیں ہے یادوں میں

بجا، درست، مگر میری بات اور ہی ہے
مرے حبیب کا رنگِ صفات اور ہی ہے

○

مخدوم کی پہلی برسی پر

○

ایسا نہیں کہ لُطف و کرم میں کمی رہی
لیکن سحر سے تا بہ سحر بے کلی رہی

آیا ترا خیال تو آنسو نکل پڑے
گر اور جی گئے بھی تو کیا زندگی رہی

کچھ دوستوں کے حُسنِ تغافل کو دیکھ کر
اپنی تو دشمنوں سے بہت دوستی رہی

ہر کام اپنے وقت پہ کرتے رہے مگر
یہ اور بات ہے کہ طبیعت بجھی رہی

پرورد گارِ شدّتِ احساس کے طفیل
ہر سانس ایک مرگِ مُسلسل بنی رہی

ہر اک حسیں خیال پہ تُو یاد آ گیا
تیرے بغیر بھی مری محفل سجی رہی

دُنیا کے ہر ستم کی شکایت تمھی سے ہے
اپنی ہر ایک آس تمھی سے بندھی رہی

سب میں ہیں اور سب سے جُدا جی رہے ہیں ہم
حالت ہماری شاذؔ بظاہر چھُپی رہی

○

موجِ خرام دُور تک رنگ نظر میں بھر گئی
تیری دراز قامتی عمُر دراز کر گئی

راہِ وفا کے موڑ پر دیر سے ہم ملے مگر
تھوڑی سی رہ گئی تو ہے مانا بہت گذر گئی

وہ تو یہیں ہے شہر میں ڈھونڈتے کیا ہو دہر میں
وحشتِ دل کو کیا کروں لے کے نگر نگر گئی

جی ہے اُداس آنکھ نم ٹوٹ کے رہ گئے ہیں ہم
باقی نہیں کوئی بھرم خاکِ انا بکھر گئی

شاذؔ ہماری ہر خوشی اپنی مثال آپ تھی
درد کا ساتھ دے گئی غم سے نباہ کر گئی

○

عذابِ ہجر بھی ہے راحتِ وصال کے ساتھ
ملی تو ہیں مجھے خوشیاں مگر ملال کے ساتھ

تمہاری یاد میں بھی ضبط و اعتدال کہاں
میں تم سے کیسے ملوں ضبط و اعتدال کے ساتھ

یہی بہت ہے زمانہ میں چار دن کے لئے
اگر حیات کٹے ایک ہم خیال کے ساتھ

کچھ اس طرح شبِ مہ نے کرن کی دستک دی
ابھر گئیں کئی چوٹیں کسی خیال کے ساتھ

اُفق نہیں تو کسی چاند کا تصوّر کیا
ستارے ڈوب گئے درد کے زوال کے ساتھ

شفق، گلال، کلی، چاندنی، الاپ، سحر
نظر کے سامنے آئے تری مثال کے ساتھ

بھٹک رہا ہوں کہ فردا کا راستہ گُم ہے
قدم قدم مرا ماضی ہے میرے حال کے ساتھ

اُسے سُنوں کہ اُسے دیکھتا رہوں اے شاذؔ
جمالِ نغمہ بھی ہے، نغمۂ جمال کے ساتھ

O

زندگی تیری رفاقت نہ ملی
آئینہ دیکھا تو صورت نہ ملی

ہم نے کیا جنسِ گراں پائی ہے
بیچنے نکلے تو قیمت نہ ملی

تو کہ ہے میری ضرورت جیسے
زندگی حسبِ ضرورت نہ ملی

ایک دُنیا ہے، جسے دُنیا میں
بار پانے کی اجازت نہ ملی

ہم ادھورے نظر آئے کیا کیا
جب ترے ملنے کی صورت نہ ملی

آج کھولا تھا درِ خانۂ دل
ایک بھی چیز سلامت نہ ملی

روز ہم قتل ہوئے شاؔذ مگر
خوں بہا کیا کہ شہادت نہ ملی

○

وہ ایک شخص اگر شہر میں سلامت ہے
ندیم و مطرب و ساقی کی کیا ضرورت ہے

اب اُس کا ذکر ہی کیا اُس سے کیا شکایت ہے
مری سُنو کہ مجھے عمر بھر کی فُرصت ہے

کبھی تھکے، نہ تھکیں گے کسی کی یاد کے پاؤں
رہِ فراق تو بے منّتِ مسافت ہے

قریب آ، مرے جینے کی مشکلیں کم کر
یہ اقتضائے محبت نہیں ضرورت ہے

ہم اپنے ناز اُٹھائیں بھلا دماغ کسے
ہم اپنے آپ سے مِل آئیں کس کو فرصت ہے

اب اور سوچ کے کیوں زندگی اُداس کریں
ہم ایک شہر میں ہیں بس یہی غنیمت ہے

گماں گذرتا ہے مر مر کے جب ملے ہیں ہم
کہ وقتِ دید نہیں ہے یہ، وقتِ رخصت ہے

جُدا ہُوں تجھ سے مگر دُور جا نہیں سکتا
کہ تو وطن میں ہے دل کو سکون و راحت ہے

تُو ماہِ مہر صفت تُو قمر نما خورشید
ترا بدن ہے کہ نکھری ہوئی تمازت ہے

ہے چاندنی شکن آلودہ اور تکیوں پر
گدازِ حلقۂ گیسو کا بارِ نکہت ہے

ستیزہ کار، نصیحت شعار، دل آزار
کہ جانِ شاذؔ کا یہ رنگ بھی قیامت ہے

○

○

زندگی قید ہے، دُنیا در و دیوار لگے
اپنی آواز بھی، زنجیر کی جھنکار لگے

اُس کا ہونا ہی بھری بزم میں ہے وجہِ سکوں
کچھ نہ بولے بھی تو وہ میرا طرفدار لگے

خواب کو چُھو لیں تو تعبیر کا جادو بولے
سنگ کو ہاتھ لگائیں تو صنم زار لگے

بات کی جھیل میں تو راز کا کنکر پھینکے
کاغذی ناؤ تمنّا کی کہیں پار لگے

دل کی دھڑکن پہ قدم رکھتا ہو جس طرح کوئی
راز بُنتی ہوئی جیسے تری رفتار لگے

وہ جو نقصان کے سودے کا مزہ جانتا ہے
لوگ دیوانہ کہیں گے مجھے فن کار لگے

ہم وہ بے بس کہ سرِ معرکۂ عُمرِ رواں
پشت ہا پشت کی لٹکی ہوئی تلوار لگے

ہائے اک اہلِ دُکاں سے ہے ندامت کیا کیا
ہم تہی جیب تھے، آنکھوں سے خریدار لگے

کسی خُوبی کا تصوّر ہی نہیں تیرے بغیر
حُسن جس جا نظر آئے ترا کردار لگے

تو وہ سادہ کہ تجھے پیار سکھانا ہوگا
بات ایسی ہو کہ اقرار نہ اِنکار لگے

شاذ اب کون کرے پہلے مسیحا کا عِلاج!
کون پرُساں ہو جب اک عہد ہی بیمار لگے

فون پر

شوخ ، شائستہ ، شگفتہ رُو ، شریر
برق کی لہروں کے ارجُن ویر کی
چُٹکیوں میں نیم کش سونے کا تیر

زیر و بم میں جیسے ترغیبِ گناہ
بات میں اک نوک سی کھُبتی ہوئی
ریشمیں سیّال ، جسمِ صوت پر
لہجگی کی کھونپ سی چبھتی ہوئی
گفتگو کے لوچ میں جلتے ہوئے
مُرکیوں کے نیلے کافوری چراغ
کچھ رُکاؤ ، کچھ بناؤ ، کچھ سبھاؤ
کچھ شفق آلودہ بِن چھلکے ایاغ

راز اندر راز جانے کون ہے ؟
دے رہے ہیں لَو ، مرے سینے کے داغ
اجنبی آواز جانے کون ہے ؟

فصیلِ فراموش گاری سے دیکھو

برستی ہوئی رات، لرزیدہ لمحے، خموشی کی پلکیں جھکی جا رہی ہیں
فصیلِ فراموش گاری سے دیکھو کہ شمعیں کہیں دُور تھرّا رہی ہیں
ہواؤں میں برفاب نشتر چھپے ہیں رگِ جاں میں خُوں منجمد ہو رہا ہے
کوئی دل کے عارض کے آنسو تو پونچھے یہ پاگل ہے کیوں بے سبب رو رہا ہے
گھنے بھیگے باغوں میں کوئل کی کوکو سُنی اَن سُنی داستاں کہہ رہی ہے
خیالوں کی نبضیں ٹٹولو تو جانو کہ سِیلی ہوئی آگ سی بہہ رہی ہے
وہ یادیں کہ جن کی جبینوں کا لکھا مری راہِ فردا کا سنگِ گراں ہے
مری صبح یا میری شب جل گئی ہے کہ حدِّ نظر تک دُھواں ہی دُھواں ہے
وہ یادیں کہ جن پر نقابیں پڑی ہیں نقابوں کو اُلٹو تو چہرے ملیں گے
وہ رنگ اب جو مدّھم نظر آ رہے ہیں قریب آ کے دیکھو تو گہرے ملیں گے

○

یہ پچھلے کی خنکی یہ چپ چاپ منظر، بدن کیا ہے، پرچھائیاں سو رہی ہیں
لویں روشنی کی صلیبیں اٹھائے کھڑی ہیں کہ تنہائیاں سو رہی ہیں
سرِ ریگ زارِ ازل چند پیکر ملے تھے مگر اب نہ جانے کہاں ہیں
ابد کے سمندر کی لہریں گنو تو ذرا دیکھنا کتنی پرچھائیاں ہیں
کئی بادباں پرزہ پرزہ پڑے ہیں نہ اب کشتیاں ہیں نہ پتوار کوئی
کہاں سے چلے تھے کہاں جا رہے ہیں نہیں روئے منزل کے آثار کوئی
وہ سانسوں کے ریلے، تمنّا کے میلے کہ ہمراز و ہمزاد تک چھٹ گئے ہیں
فنا کھینچتی ہے، بقا روکتی ہے، کشاکش کی بازی میں سب لٹ گئے ہیں
اکیلے پرندہ کی آواز گونجی گھٹاؤں میں کوندا سا لہرا رہا ہے
کہیں دور لفظوں کے زینہ پہ سایہ معانی کا تابوت لے جا رہا ہے

○

○

دُور تک پیچ و خمِ رنگ نظر پڑتے ہیں
درد کی جھیل میں یادوں کے بھنور پڑتے ہیں

ہم وہ موتی ہیں بہ ہنگامِ سحر گلشن میں
جب پروئے نہیں جاتے تو بکھر پڑتے ہیں

بستیاں جاگ رہی ہیں یہ غنیمت جانو
آگے اِس راہ میں سنسان نگر پڑتے ہیں

ہم نے کی سیرِ جہاں راہ میں دیکھا یہ میاں
جن کے دروازے نہیں ہوتے وہ گھر پڑتے ہیں

صرف پرچھائیاں ہیں کس کے خد و خال رنگیں
اِدھر آئینے ہیں اور عکس اُدھر پڑتے ہیں

اُن تھکے ہارے پرندوں کا خیال آتا ہے
جو کسی بام پہ ناچار اُتر پڑتے ہیں

شاذؔ درپیش ہے صدیوں کا سفر لمحوں میں
گردِ جادہ کی طرح شام و سحر پڑتے ہیں

○

کب چین پڑے اے دل کب درد کو کل آئے
پھر شام ہوئی، گھر سے گھبرا کے نکل آئے

ہم نے بھی یہ چاہا تھا ہنس بول کے رخصت ہوں
جاں تھی کہ تڑپ اُٹھی آنسو تھے نکل آئے

جب کم نظری دیکھی آپ اپنے سے ضد ٹھہری،
وہ خاک جو سونا تھی مٹّی سے بدل آئے

محرومِ نظارہ تھے جب کُنج میں گُل مہکے،
تھے دستِ شکستہ ہم جب شاخ پہ پھل آئے

اے ارض و سما تجھ میں دل بن کے دھڑکتے ہیں
کچھ یونہی نہیں ہم کو آدابِ غزل آئے

فردوس بدر ہو کر پھر سوئے زمیں لوٹیں!
پھر ساتھ جئیں ہم تم پھر صبحِ ازل آئے

تعمیر کا شاذ اُس دن کیا کیا نہ خیال آیا
جب میرے درِ دل تک تم پہلے پہل آئے

○
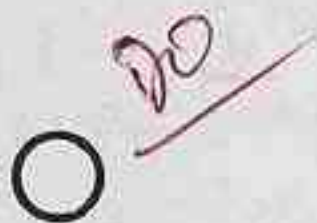
کچھ عجب آن سے لوگوں میں رہا کرتے تھے
ہم خفا رہ کے بھی آپس میں مِلا کرتے تھے

اتنی تہذیبِ رہ و رسم تو باقی تھی کہ وہ
لاکھ رنجش سہی وعدہ تو وفا کرتے تھے

اُس نے پوچھا تھا کئی بار، مگر کیا کہتے
ہم مزاجاً ہی پریشان رہا کرتے تھے

ختم تھا ہم پہ محبت کا تماشہ گویا
رُوح اور جِسم کو ہر روز جُدا کرتے تھے

ایک چپ چاپ لگن سی تھی ترے بارے میں
لوگ آ آ کے سُناتے تھے سُنا کرتے تھے

تیری صُورت سے خدا سے بھی شناسائی تھی
کیسے کیسے ترے ملنے کی دُعا کرتے تھے

اُس کو ہمراہ لئے آتے تھے میری خاطر
میرے غم خوار مرے حق میں بُرا کرتے تھے

زندگی ہم سے ترے ناز اُٹھائے نہ گئے
سانس لینے کی فقط رسم ادا کرتے تھے

ہم برس پڑتے تھے شاذؔ اپنی ہی تنہائی پر
ابر کی طرح کسی در سے اُٹھا کرتے تھے

○

مرا ضمیر بہت ہے مجھے سزا کے لئے
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لئے

وہ کشتیاں مری، پتوار جن کے ٹوٹ گئے
وہ بادباں جو ترستے رہے ہوا کے لئے

بس ایک ہوک سی دل سے اُٹھے گھٹا کی طرح
کہ حرف و صوت ضروری نہیں دُعا کے لئے

جہاں میں رہ کے جہاں سے برابری کی یہ چوٹ
اک امتحانِ مُسلسل مری انا کے لئے

نمیدہ خُو ہے یہ مٹّی ہر ایک موسم میں
زمینِ دل ہے ترستی نہیں گھٹا کے لئے

میں تیرا دوست ہوں تو مجھ سے اِس طرح تو نہ مِل
برت یہ رسم کسی صورت آشنا کے لئے

مِلوں گا خاک میں اک روز بیج کے مانند
فنا پُکار رہی ہے مجھے بقا کے لئے

مہ و ستارہ و خُورشید و چرخِ ہفت اقلیم
یہ اہتمام مرے دستِ نارسا کے لئے

جفا جفا ہی اگر ہے تو رنج کیا ہو شاذ
وفا کی پُشت پناہی بھی ہو جفا کے لئے

نئے موسم یُونہی آتے رہیں گے
پُرانے درد چمکاتے رہیں گے

ہمیں معلوم تھا ہم تجھ سے چھُٹ کر
جہاں جائیں گے گھبراتے رہیں گے

گنہ توفیق ہے جس کو عطا ہو
نہیں وہ ہم کہ پچھتاتے رہیں گے

یہ مانا دل کو سمجھانا ہے مشکل
مگر ہم دل کو سمجھاتے رہیں گے

پکارے گی ہمیں منزل مگر ہم
گھنی چھاؤں میں سستاتے رہیں گے

بچھڑ کر پھر ملیں، پھر مل کے بچھڑیں
کہاں تک دل کو سمجھاتے رہیں گے

خبر کیا تھی کہ شورِ زندگی میں
وہ چلتے پھرتے یاد آتے رہیں گے

کہا اُس نے کہ ہم کم کم ملیں شاذؔ
ترس جائیں گے ترساتے رہیں گے

○

تمہیں بھی شاذؔ یقیں نہ آئے کہاں کہاں یاد آ گئے تم
کرم کیا، شورشِ جہاں میں اُداس رہنا سِکھا گئے تم

خزاں کا موسم، اُداس گلشن، سکوتِ مبہم، گدازِ شیون
میں برگِ تنہا نہالِ غم پر ہوا کی مانند آ گئے تم

نہ دل پہ ہے اختیار مجھ کو نہ آنکھ پر اعتبار مجھ کو
میں کیسے مانوں کہ آئے تھے تم اگر گئے ہو تو کیا گئے تم

فِراق کا درد ہے پُرانا وصال کا زخم کس نے جانا
میں اپنے آنسو نہ روک پایا کچھ آج اتنا ہنسا گئے تم

گذر ہو کیسا یہ کیا ستم ہے جہاں کی محراب قد سے کم ہے
کہاں گئی شاذؔ سر بلندی کہاں کہاں سر جھکا گئے تم

سانسوں میں بسے ہو تم آنکھوں میں چھپا لوں گا
جب چاہوں تمہیں دیکھوں آئینہ بنا لوں گا

یادوں سے کہو میری بالیں سے چلی جائیں
اب اے شبِ تنہائی آرام ذرا لوں گا

رنجش سے جدائی تک کیا سانحہ گزرا ہے
کیا کیا مجھے دعویٰ تھا جب چاہوں منا لوں گا

تصویرِ خیالی ہے، ہر آنکھ سوالی ہے
دنیا مجھے، کیا دے گی دنیا سے میں کیا لوں گا

کب لوٹ کے آؤ گے اصرار نہیں کرتا
اتنا مرے بس میں ہے میں عمر گھٹا لوں گا

کیا تہمتیں دنیا نے اے شاذؔ اٹھائی ہیں
اک تہمتِ ہستی تھی، سوچا تھا اٹھا لوں گا

ایر ہوسٹس

اُتر کے آئے ہیں ایتھر کی سیڑھیوں سے ہم
غُبارِ نغمہ کی مہکار ہے یمین و یسار
کھنک رہی ہے فضا سُر جگا رہا ہے ستار
وہ دیوداسی کی مانند ہاتھ جوڑے ہوئے
کھڑی ہوئی ہے شفق بر لبِ وسحر بہ کنار
خفیف سا خمِ گردن سلامِ رخصت پر
خیال آتے ہیں کیا کیا تری مروّت پر
یہ خندہ روئی یہ حُسنِ سلوک یہ نرمی
اے ابر و باد کی بیٹی خلا کی شہزادی
اک التجا ہے بہ وصفِ رفاقتِ کم کم
کوئی تبسّمِ پنہاں زمیں کی حالت پر

○

ماورا

مجھے چارہ گر سے خبر ملی
وہ پھر آ گئی یہیں شہر میں
مجھے یوں لگا کہ مرے لئے
کوئی آسرا نہیں شہر میں
مجھے اُس سے کہنا ہے بس یہی
سرِ راہِ شورشِ زندگی
کہ ملے تو آنکھ چُرا نہ لے
کہ جو درد رُوح میں بس گئے
کہ ہم ایک ایک کو جس طرح
پسِ ماہ و سال ترس گئے
یہ وہ غم ہیں ماضی و حال کے
جو نہیں ہیں بس میں وصال کے

○

رائیگاں

کبھی رُت بہار کی گر مِلے
کبھی پورے چاند کی رات ہو

گھنے جنگلوں کا سفر ملے
کبھی قبلۂ رُخ کی گھٹا اُٹھے

سرِ کِشت و خاک کی آس میں
سرِ کوہسار برس پڑے

تو مری وفاؤں کو یاد کر
تو مری دُعاؤں کو یاد کر

○

یاں نفس واں نکہتِ گُل ہے

مری آواز میں تھا ٹوٹتی راتوں کا سنّاٹا
مرے لہجہ میں جیسے گھُل رہی تھی میری تنہائی
شکستہ ہو رہی تھیں سیڑھیاں خوابیدہ لفظوں کی
معانی تھے سرِ بامِ سخن گویا تماشائی
تعجّب ہے کہ اُس نے میرے اظہارِ تمنّا پر
کوئی حیرت نہ کی چُپکے سے باہوں میں سمٹ آئی

○

○

خیال آتے ہی کل شب تجھے بھُلانے کا
چراغ بجھ گیا جیسے مرے سرہانے کا

ہیں پتیاں کہ لبِ رازِ آشنا جیسے
عجب سماں ہے درِ گُل کو کھٹ کھٹانے کا

زمانہ راز بہ سینہ ہے، ایسا لگتا ہے
کہ منتظر ہے ابھی تک کسی بہانے کا

تری نگاہ کو ایفائے عہد کہتے ہیں
گِلہ کسی سے کریں کیا ترے نہ آنے کا

قریب سے یہ نظارے بھلے نہیں لگتے
بہت دنوں سے ارادہ ہے دُور جانے کا

یہ کائنات سوالات کا دُھندلکا ہے
جواب مل نہ سکا آج تک ٹھکانے کا

یہ مہر و ماہ بھی پابندِ وقت ہیں لیکن
نہیں ہے وقت کوئی تیرے یاد آنے کا

تمام ارض و سما ہے کلید کی مانند
میں ڈھونڈھتا ہوں درِ گمشدہ خزانے کا

میں اور کوئی بہانہ تلاش کر لوں گا
تو اپنے سر نہ لے الزام دل دُکھانے کا

چلی ہے رسم درہِ رنجِ خوش دلی ہم سے
کلیجہ چاہیئے اپنی ہنسی اڑانے کا

ابھی لبوں پہ تبسّم کی راکھ باقی ہے
کھنڈر سے پوچھنا یہ بُت ہے کس زمانے کا

نہ جانے کیوں در و دیوار ہنس پڑے اے شاذ
خیال آیا تھا اک روز گھر سجانے کا

○

اکثر ترے کوچے سے ہم ہاتھ مَلے آئے
اللہ ری مجبوری آنا تھا، چلے آئے

کھینچا ہے ستم ہم نے ڈھالا ہے صنم ہم نے
ہاتھوں کا مقدّر تھا پتّھر کے تلے آئے

کیا عمرِ دو روزہ تھی کیا راہ تکی ہم نے
اے دیر شناسا تم، آئے ہو بھلے آئے

ہر خطِّ بدن اُس کا دیوانِ نزاکت ہے
کس نوکِ پلک سے یہ اشعار ڈھلے آئے

اے شاذؔ شبِ غم سے زینہ پہ شفق کے ہم
رخصت ہوئے رو رو کے مِل مِل کے گلے آئے

○

میں حسرتوں کے دوراہے پہ ڈگمگاؤں گا
نہ تجھ کو یاد کروں گا نہ بھول جاؤں گا

تمھی سناؤ کہ یہ لمحۂ غنیمت ہے
گذر گئی ہے جو مجھ پر وہ پھر سناؤں گا

وہ اک کھلونا جسے طفلِ آرزو نہ ملا
خبر نہ تھی کہ میں اِس طرح ٹوٹ جاؤں گا

یہ آگہی ہے کسی پیرِ تسمہ پا کی طرح
یہ بار سر سے اتاروں تو سر اُٹھاؤں گا

پہنچ سکے نہ کوئی تشنگی کے دریا تک
میں اپنے نقشِ قدم دُور تک مٹاؤں گا

بدن کا عکس تو آئینۂ لباس میں ہے
مگر یہ نکتۂ عریاں کسے سمجھاؤں گا

ہر آشنا سے ہُوں بیگانہ کیا قیامت ہے
میں تجھ سے رُوٹھ کے کِس کِس سے رُوٹھ جاؤں گا

گِلہ نہیں مرے احباب نیک نیّت تھے
کہ میں شراب سے دُکھ درد بھول جاؤں گا

مجھے یہ ناز کہ میں تیرے ناز اُٹھاتا ہوں
مجھے یہ زعم کہ میں تیرا دل دُکھاؤں گا

مرا وجود ادھورا ہے جیسے تیرے بغیر
میں تجھ سے چھُوٹ کے کِس کِس سے منہ چھُپاؤں گا

تجھے خبر ہی نہیں کِس قدر حَسین ہے تُو
ہر آئینہ سے سراپا ترا چھپاؤں گا

وہ ایک در جسے دستک کی آس تھی کیا کیا
گماں نہ تھا کہ میں چوکھٹ سے لَوٹ آؤں گا

خفا تھے چہرے کہ آئینہ ساز کیوں ہے شاذؔ
مگر میں باز نہ آیا نہ باز آؤں گا

○

جمال و فکر کی تہذیب کا عقیدہ ہوں
تو حُسن ہے میں ترے حُسن کا قصیدہ ہوں

تو سیرِ گلشنِ ہستی کرے تو جانے گا
میں برگ برگ پہ تحریرِ پیدہ پیدہ ہوں

اُترتے دیکھے ہیں کتنے چڑھے ہوئے دریا
میں تشنہ کام نہیں ہوں سراب دیدہ ہوں

قیام ہے کہ سفر کچھ پتہ نہیں چلتا
رُکا ہوا ہوں مگر جادۂ رمیدہ ہوں

نہ ہو سکی ہے ملاقات اپنے آپ سے بھی
میں اپنے واسطے اک زہرِ ناچشیدہ ہوں

تری نگاہِ کرم نے مٹا دیا مجھ کو
مری مثال کہ آہِ اثر خریدہ ہوں

کوئی بُرا نہ کہے اُس کشیدہ قامت کو
یہ اور بات کہ میں اِن دنوں کشیدہ ہوں

خدا کے نام پہ جو کاروبار کرتے ہیں
میں رِند ہوں مگر اُن سب سے برگزیدہ ہوں

نہ دیکھ پاؤں گا شاذؔ آنکھ بھر کے دُنیا کو
کوئی نہ چھیڑے کہ میں یوں بھی آب دیدہ ہوں

○

○

دُکھ دیتے اُس نے بہت اب کے دُکھن اور ہی ہے
مجھ سے مِل کر بھی نہ مِلنے کا چلن اور ہی ہے

ہم جو روٹھیں بھی تو منئے کے بہانے ڈھونڈھیں
اب کے رنجش میں تو دُوری کی چُبھن اور ہی ہے

آمدِ صُبح کو دیکھا ہے دُھندلکے میں مگر
صندلیں رنگ میں یہ سانولا پن اور ہی ہے

یوں بھی کچھ دن کے لئے دُور رہا ہوں تجھ سے
لیکن اِس بار سفر کی یہ تھکن اور ہی ہے

گھر نے سمجھا، نہ اِسے اہلِ وطن نے جانا
میرا گھر اور ہی ہے، میرا وطن اور ہی ہے

سب سے اِس طرح نہ مِل لوگ ہیں خوش فہم بہت
لوگ کیا جانیں کہ اِظہار کا فن اور ہی ہے

میری باتوں پہ تری جنبشِ سر، وقتِ خرام
زُلفِ پابوس کی یہ پینگ یہ گھن اور ہی ہے

تو بدن ہی نہیں احساس بھی ہے رُوح بھی ہے
سر سے پا تک ترا بے ساختہ پن اور ہی ہے

اب کے چین پایا نہ ماتھے کی شکن بھی اس کی
کیا کہوں شاذ کہ ماتھے کی شکن اور ہی ہے

○

شیشۂ دل تمہارے ہاتھ سے ٹوٹا ہوں ابھی
کوئی آئے مجھے چُن لے کہ میں بکھرا ہوں ابھی

زندگی تُو نے بہت راہ تکی ہے میری
میں کہ اپنے لئے بھُولا ہوا وعدہ ہوں ابھی

عُمر کیا جانے گذرتی ہی چلی جاتی ہے
کس کی امید ہوں کس کس کا تقاضہ ہوں ابھی

فاصلے آج یہ قربت کے سبب سے نکلے
تو مرے ساتھ بھی ہے اور میں تنہا ہوں ابھی

دیکھ کر مجھ کو اتر جاتے ہیں چہرے کتنے
کتنے چہرے ہیں کہ جن کے لئے پردہ ہوں ابھی

آنکھ لگ جائے تو کس درجہ سکوں ملتا ہے
آنکھ کھلتے ہی یہ احساس کہ زندہ ہوں ابھی

شاذؔ جی میں ہے کہ اپنے سے جُدا ہو جاؤں
کس کو سمجھاؤں کہ تیرے لئے اپنا ہوں ابھی

○

میں کہ ہوں تیری رفاقت کے بغیر
جیسے اک سایہ ہو قامت کے بغیر

اتنے برسوں میں یہ پہلی شب ہے
چاند دیکھا تری صُورت کے بغیر

تجھ پہ کیا گذری تھی، اِنکار نہ کر
چار دن میری محبّت کے بغیر

روز ملنے کی نہ عادت پڑ جائے
وصل کچھ بھی نہیں فُرقت کے بغیر

کون سمجھے گا گناہوں کا ثواب
حُسنِ معصوم کی نیّت کے بغیر

یوں لگا بزمِ جہاں میں یارب
میں چلا آیا اجازت کے بغیر

ہم کہ مجنوں بھی تھے فرہاد بھی شاذؔ
شہر میں پھرتے تھے وحشت کے بغیر

○

رات ہے، برسات ہے اور تو بہت یاد آئے ہے
جامِ صہبا سامنے ہے، تشنگی چھلکائے ہے

اُس سے مِل کر بھی وہی عالم نہ مل کر بھی وہی
دل کو جیسے کوئی شعلہ سا لپٹتا جائے ہے

نارسائی کے سبب سے سرگراں رہتے ہیں ہم
آئے دن کی رنجشوں سے جی بہت گھبرائے ہے

رت جگوں کی رُت گئی، بسترلگا تو دیں مگر
نیند کانٹوں کی طرح آنکھوں میں چبھتی جائے ہے

ناخُداؤں کو خُدا توفیقِ بینائی بھی دے
اک سفینہ ہے، بھنور کی گود میں چکرائے ہے

صحنِ گلشن میں اُداسی کا سماں ہے دُور تک
اک پرندہ اُڑ چلا ہے شاخِ گُل تھرّائے ہے

دل کی وادی میں تشبیبوں سے پرے پچھلے پہر
شاذؔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی گاتا جائے ہے

○

روز کچھ خواب سہانے ڈھونڈوں
تیرے ملنے کے بہانے ڈھونڈوں

شرط یہ ہے کہ مرا حال نہ سُن
میں تجھے حال سُنانے ڈھونڈوں

اے شبِ غم کوئی غم خوار تو دے
اپنی ہی خیر منانے ڈھونڈوں

دُور تک دشتِ فراموشی ہے
کس خرابے میں خزانے ڈھونڈوں

آپ اپنے سے خفا ہو جاؤں!
آپ اپنے کو منانے ڈھونڈوں

نیم شب کوئی جگاتا ہے ضرور
کیا دھرا ہے کہ سرہانے ڈھونڈوں

آج رونے کو بہت جی چاہے
شاؔد کچھ دوست پرانے ڈھونڈوں

○

یوں بھی ارزاں تو نہ تھے ہو گئے نایاب سے ہم
تو ملا چھوٹ گئے محفلِ احباب سے ہم

کوئی خواہش نہ تمنا نہ شکایت نہ گلہ
سب کو دیکھ آئے اِسی دیدۂ پُرآب سے ہم

کچھ نہ کچھ تیری کمی تو کوئی پوری کرتا
اتنی اُلفت تو نہ رکھتے تھے مئے ناب سے ہم

اپنی تقدیر کے مفہوم سے مانوس ہوئے
تیری تحریر ترے خط ترے القاب سے ہم

بند آنکھوں کی طرح تھا یہ جہانِ بیدار
کوئی تعبیر تو ملتی کہ رہے خواب سے ہم

آمدِ صبح میں تاخیر ہوئی جاتی تھی
روک کر بات کیا کرتے تھے مہتاب سے ہم

شاؔذ جب رات گذر جاتی ہے، یوں لگتا ہے
ایک طوفاں تھا، اُبھر آئے تہِ آب سے ہم

آدھی رات پورا چاند

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے

یہ آدھی رات، پورا چاند، آنگن
رمِ آہو، مری عمرِ گریزاں
یہ زخمِ آگہی، یہ شورشِ جاں
یہ وجدانِ نظر، ادراکِ گلشن،
میں شبنم سے شرر کو چھو رہا ہوں
یہ لمحوں کی کشیدہ مئے، یہ بوندیں
زباں کی نوک سے یوں چھو رہا ہوں
رگوں میں چاندنی سی کھِل رہی ہے
مجھے خود اپنی آہٹ رل رہی ہے

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے

نظارے رفتہ رفتہ کھُل رہے ہیں
فضا ہم راز ہوتی جا رہی ہے
کہیں اب آسماں جھُکنے لگا ہے
زمیں کافر تھی ایماں لا رہی ہے
گگن اوسر نہیں ہے، بیج بوئیں
کوئی مستقبلِ شاداب کاٹیں
سُنو، فصلِ شعور اب پک چلی ہے
چلو تعبیر لائیں، خواب کاٹیں
مجھے امکاں کی پہنائی ملی ہے
صدا دیتی ہیں سیّاروں کی نبضیں
خلاؤں کی مسیحائی ملی ہے

بھلا یہ کون دستک دے رہا ہے
کوئی غم، کوئی ماضی، کوئی افسوں
کسی بے جسم سائے کی صدا ہے
زوالِ عمر ہے یا موت! کیا ہے
کوئی کہہ دے کہ میں گھر پر نہیں ہوں

○

"دستِ نارسیدہ"

خیالوں کا گھنا جنگل
سوالوں کے ہزاروں ناگ جیسے سرسراتے ہیں
جوابوں کے شکستہ پر پرندے سہمے جاتے ہیں
بقا کے پھل فنا کے پیڑ پر ہوتے ہیں آویزاں
بقا یک سعیِ دستِ نارسیدہ ہے
زمانہ آب دیدہ ہے

○

ایک روزہ

آج پابندِ صوم تھا یہ حقیر
بارگاہِ خدا میں سجدہ گذار
عرق آلود، منفعل، نادم
کر رہا تھا گُنہ گُنہ کا شُمار
اِس طرح تھی مِثالِ فدوی کی
جیسے بازارِ نقد میں ہو اُدھار
جیسے اک روز عید سے پہلے
کوئی مفلس لئے لباسِ تار
جائے اک نامور خیاط کے پاس
چند ٹانکوں پہ ہو جسے اِصرار

○

زنجیر کی چیخ

سمندر تجھے چھوڑ کر جا رہا ہوں
تو یہ مت سمجھنا
کہ میں تیری موجوں کی زنجیر کی چیخ سے بے خبر ہوں

یہی میں نے سوچا ہے اپنی زمیں کو
اُفق سے پرے یوں بچھا دوں
حدِ این و آں تک اٹھا دوں
وہ تُو ہو کہ میں
اپنی وُسعت میں لا انتہا ہیں
مگر ہم کناروں کے مارے ہوئے ہیں

○

○

یہ تو ممکن نہیں چُپ چاپ فنا ہو جاؤں
میں تو سناٹا ہوں بکھروں تو صدا ہو جاؤں

جی میں ہے اپنے ہی پہلو سے جُدا ہو جاؤں
رات کٹ جائے تو کیا جانیے کیا ہو جاؤں

میں وہ مجبور کہ راضی بہ رضا ہو جاؤں
تو اگر بابِ اثر ہے تو دُعا ہو جاؤں

ایک دُنیا مجھے مل جائے مگر شرط یہ ہے
ایک دُنیا کی نگاہوں میں بُرا ہو جاؤں

تُو محبّت ہے زمانے کو ضرورت ہے تری
میں تو اک رسمِ محبّت ہوں ادا ہو جاؤں

دشت کا ماجرا کانٹوں کی زباں بن کے کہوں
کُنج میں جاؤں تو پھُولوں کی قبا ہو جاؤں

کھینچ دوں چرخِ وفا پر کوئی پَل بھر کی لکیر
کاش ٹوٹے ہوئے تارے کی ضیا ہو جاؤں

دستِ قاتل ہے اُدھر میرا لہو چپ ہے اِدھر
دیکھنا یہ ہے کہ کب روزِ جزا ہو جاؤں

سب خُدا ہیں کوئی انساں تو ملے شاذؔ مجھے
میں تو پتھر بھی نہیں ہوں کہ خُدا ہو جاؤں

○

احساسِ وفا جب تم میں نہیں اظہارِ تمنّا کس کے لئے
اب روٹھنا منّا کیا معنی اب رنجشِ بے جا کس کے لئے

چھیڑے تو کوئی، ہم پھوٹ بہیں، کیا کس کی سُنیں کیا کس سے کہیں
آنکھوں کے کھنڈر سے کیا پوچھیں ٹھہرا ہے یہ دریا کس کے لئے

اعزاز تھی کل تک رُسوائی اب ہم ہیں ہماری تنہائی
آئینہ تو ٹھہرا ہرجائی اُترا ہوا چہرا کس کے لئے

کہتے تھے بہت کہنا بھی گیا کیا کیا نہ سہا، سہنا بھی گیا
اک چاند تھا وہ گہنا بھی گیا راتوں کا یہ رونا کس کے لئے

کیا بادِ سمومِ ہجر چلی کیا راکھ ہوئی اک ایک کلی،
شاذؔ اب بھی ہے کیا وہ در، وہ گلی باقی ہے وہ رستہ کس کے لئے

○

مری فرزانگی بھی ہے جنوں، تُم کیوں نہیں کہتے
میں کس کے واسطے برباد ہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

بھلا اِس طرح کوئی زندگی برباد کرتا ہے
میں اب اِس سے زیادہ کیا کہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

یہ مجبوری، یہ رنجوری یہ دُوری تُم پہ روشن ہے
میں ایسی زندگی کو کیا کروں، تُم کیوں نہیں کہتے

نہ رونا ہے نہ ہنسنا جی کا کیسے بوجھ ہلکا ہو
میں روؤں کس طرح کیونکر ہنسوں، تُم کیوں نہیں کہتے

اِدھر میں ہوں، اُدھر دُنیا ہے، کیا کیا کہتی جاتی ہے
تمہارے ہوتے کس کس کی سُنوں، تُم کیوں نہیں کہتے

بُرا کیا ہے اگر تُم مان لو اپنی خطائیں بھی
خطا جب ہو مری، میں تو کہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

وہ اک لمحہ کہ جب مجھ پر وفا کا جُرم ثابت ہو
وہ اک لمحہ کہ جب میں چپ رہوں، تُم کیوں نہیں کہتے

یہ سچ ہے شاذؔ، ہم اک دوسرے کے غم سے زندہ ہیں
مجھے یہ رنج یہ رازِ دروں، تُم کیوں نہیں کہتے

○

ہم آج کوئی سخن زیرِ لب نہیں رکھتے
توقع اُن سے تو رکھتے تھے اب نہیں رکھتے

کمی نہ ہوگی ضیافت میں چشم و ابرو کی
ہم آئینہ میں ترا عکس کب نہیں رکھتے

بجھا دے کوئی، کہ آنکھیں سوال کرتی ہیں
ہمیں یہ وہم کہ دستِ طلب نہیں رکھتے

جبینِ سنگ پہ بھی زخمِ تیشہ آتے ہیں
ذرا سنبھل کہ یہ احساس سب نہیں رکھتے

ہر ایک چیز سے دل اُٹھ گیا ہے شاذؔ اپنا
وہ بے دلی ہے کہ کوئی سبب نہیں رکھتے

○

بہت دنوں سے ہے جی میں سوال پوچھوں گا
میں تیرے آئینہ سے تیرا حال پوچھوں گا

بہت حسین ہے یہ دُنیا مگر زوال کے ساتھ
خدا سے حشر میں حُسنِ زوال پوچھوں گا

سکوتِ شام سے کیوں نسبتِ طبیعت ہے
سکوتِ شام سے وجہِ ملال پوچھوں گا

تُو بے مثال ہے تیری مثال کیا پوچھوں
میں کچھ نہیں مگر اپنی مثال پوچھوں گا

مرا خیال ہے میری نگاہ میں ہے جمال
ترے جمال کا کیا ہے خیال پوچھوں گا

خرابِ عکس ہیں شیشہ بدست کیوں ساقی
قصورِ بادۂ جامِ سفال پوچھوں گا

فضا اُداس ہے جنگل کی سائیں سائیں ہے شاذ
میں کس سے وحشتِ چشمِ غزال پوچھوں گا

○

تمام قول و قسم تھا، مُکر گیا ہے کوئی
میں رو پڑا ہوں کہ جی سے اُتر گیا ہے کوئی

کبھی کبھی تو ظرافت بھی خوں رُلاتی ہے
ہنسی کی طرح فضا میں بکھر گیا ہے کوئی

نہ اب تو دیں میں کشش رہ گئی نہ دُنیا میں
یہ مجھ پہ آخری احسان کر گیا ہے کوئی

نہیں ہے میزباں جس کا یہ کون مہماں ہے
کھنڈر سی آنکھوں میں آ کر ٹھہر گیا ہے کوئی

میں آپ اپنی کمیں گاہ تھا، شکار بھی تھا
وہ میں تھا یا مرا سایہ تھا، مر گیا ہے کوئی

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا

وہ راستہ تو مرے گھر کا راستہ بھی نہیں
اُدھر سے پچھلے پہر بارہا گُذرتا ہوں
یہ احتیاط زمیں پاؤں تھام لے نہ کہیں
کہ رہ نہ جائے کوئی نقشِ پا، گُذرتا ہوں
برآمدے سے کہیں روشنی سی چَھنتی ہوئی
کرن لجائی ہوئی، دِلبری سی جھِجھکتی ہوئی
چَٹکتی جاتی ہے ہر پور جیسے منظر کی
یہ عیشِ دیدۂ پُرآب ہے، مجھے بَس ہے
یہ کیسی آس ہے اب تک، یہ کیسی ڈھارس ہے
کہ جاگتی ہیں ابھی کھڑکیاں ترے گھر کی

○

مُتوسّط طبقہ

مثالِ دستِ کُشادہ ہے یہ خُدا کی زمیں

نہ جانے کب سے ہے پہلو میں کشت زار لیئے

تمام دولتِ فضا نکہتوں کا بار لیئے

یہ ماہتاب کہ گرُدوں پہ کُندنی چھتنار

یہ خنکیاں یہ دھندلکا یہ شہرِ خواب آثار

یہ آفتاب کہ کرنوں کا آبشار لیئے

بچھا رہا ہے زرِ روشنی یمین و یسار

ہوا کی موج میں ہے تازگی و برنائی

اُفق سے تابہ اُفق ہے دھنک کی انگڑائی

یہ سیلِ دریا کہ سیرابیوں کا ضامن ہے

برس رہا ہے پیاپے سحابِ گوہر بار

یہ کوہسار ہے نیلم، یہ دشت، معدن ہے

کہ انتظار، ارادہ ہے یہ خُدا کی زمیں

تماشہ بیں ہیں، نظارہ شعار ہیں ہم لوگ
ہمیں تو فُرصتِ نظارگی بھی کم کم ہے
مِلا ہے جُرعۂ مے، بےخودی بھی کم کم ہے
گریباں چاک نہیں، بخیہ کار ہیں ہم لوگ
ہمیں تو دہر نے دی ہیں حساب سے کرنیں
ہمیں یہ وہم کہ دستِ طلب نہیں رکھتے
ہم اپنے باب میں سوچیں تو کس طرح سوچیں
یہی سبب ہے کہ کوئی سبب نہیں رکھتے
نہ آستیں پہ لہو ہے نہ داغ دامن پر
بدن فگار نہیں جاں فگار ہیں ہم لوگ
روائتیں ہیں، عقیدے ہیں، دوش و گردن پر
ہمارا پوچھنا کیا وضع دار ہیں ہم لوگ
ہماری رُوح کی عُریانیوں کے مدفن پر
ہمارے تن کا لبادہ ہے یہ خُدا کی زمیں

○

میں لوٹ آؤں کہیں تو یہ سوچتا ہی نہ ہو
کہ رات دیر گئے تیرا در کھلا ہی نہ ہو

نہیں کہ زیست سے کچھ واسطہ پڑا ہی نہ ہو
میں کیسے مانوں ترا دل کبھی دکھا ہی نہ ہو

تلاش کر اُسے دیوار و در کے پہروں میں
عجب نہیں تری محفل سے وہ اٹھا ہی نہ ہو

اک اعتمادِ وفا ہے کہ جی رہا ہوں میں
کہ میرے حال کا شائد اُسے پتہ ہی نہ ہو

یہ راستہ تو اُسی در پہ جا کے رُکتا تھا
کہ وہ خفا ہے تو یہ راستہ مُڑا ہی نہ ہو

میں یونہی اُس سے خفا ہوں مگر مجھے ڈر ہے
منانے والا حقیقت میں خود خفا ہی نہ ہو

مجھے تو تجھ پہ خود اپنا گماں گذرتا ہے
ترا تھکا ہوا لہجہ مری دُعا ہی نہ ہو

گُناہ اور حسین، اہرمن کے بس میں نہیں
ستم ظریف کوئی بندۂ خدا ہی نہ ہو

میں سوچتا ہوں کہ آپ اپنی دشمنی کیا ہے
مرا وجود مری ذات سے جُدا ہی نہ ہو

بڑے بڑوں کے نشیب و فراز دیکھے ہیں
کوئی ملے تو سہی جس کا سر جُھکا ہی نہ ہو

نہ جانے کتنے ہیں سیّارگانِ نادیدہ
تُو انتہا جسے کہتا ہے ابتدا ہی نہ ہو

وہ لاکھ غم سہی ایسا نہیں، یہ دُنیا ہے
کہ شاذؔ اُس سے بچھڑ کر کبھی ہنسا ہی نہ ہو

○

شکن شکن تری یادیں ہیں میرے بستر کی
غزل کے شعر نہیں کروٹیں ہیں شب بھر کی

پھر آئی رات، مری سانس رُکتی جاتی ہے
سرکتی آتی ہیں دیواریں پھر مرے گھر کی

مجھے تو کرنی پڑی آب یاریِ صحرا
مگر نصیب میں تھی تشنگی سمندر کی

یہ جمع و خرچِ زبانی ہے نقدِ شعر و سُخن
مگر یہی تو کمائی ہے زندگی بھر کی

اُسی نے بخشی ہے رنگینیٔ حیات مجھے
کبھی کبھی تو اُسی نے حیات دُوبھر کی

رِدائے رنگ سے چھَنتا ہوا بدن تیرا
یہ چاندنی کہ تمازت ہے تیرے پیکر کی

کتابِ حُسن ہے تُو، مل کھُلی کتاب کی طرح
یہی کتاب تو مرمر کے میں نے ازبر کی

صنم کی آس لئے نوکِ تیشہ بوتا ہوں
میں کب سے فصل اُگاتا رہا ہوں پتھّر کی

نباہ کرتا ہوں دُنیا سے اِس طرح اے شاذؔ
کہ جیسے دوستی ہو آستین و خنجر کی

○

رنجش کے بعد آج ترا سامنا ہے پھر
مایوس ہو چلی تھی طبیعت یہ کیا ہے پھر

پھر خشت و سنگِ خواب کی زد میں ہے زندگی
گریہ عمارتِ دل و جاں ڈھا رہا ہے پھر

کس طرح کوئی پرورشِ ہر نفَس کرے
سمجھا چکے تھے دل کو یہ گھبرا رہا ہے پھر

سُرخی لہو کی آنکھ سے اب تک نہیں گئی
رُک جا، نہ جا اُدھر کہ وہی سلسلہ ہے پھر

اک بار دل دُکھا تھا یہ کافی نہیں ہے کیا
تُو خود یہ کہہ رہا ہے ترا دل دُکھا ہے پھر

کچھ دیر رو بھی لے کہ طبیعت بحال ہو
کیا سوچنے سے فائدہ کیوں سوچتا ہے پھر

یہ عُمر تو سزا کی طرح کٹ رہی ہے شاذؔ
اب اس سزا کے بعد سُنا ہے سزا ہے پھر

○

ذرا سی بات تھی، بات آ گئی جُدائی تک
ہنسی نے چھوڑ دیا لا کے جگ ہنسائی تک

بھلے سے اب کوئی تیری بھلائی گنوائے
کہ میں نے چاہا تھا تجھ کو تیری بُرائی تک

تُو چُپکے چُپکے مُروّت سے کیوں بچھڑتا ہے
مرا غُرور بھی تھا تیری کج ادائی تک

مجھے تو اپنی ندامت کی داد بھی نہ ملی
میں اُس کے ساتھ رہا اپنی نارسائی تک

اس آئینہ کا تو اب ریزہ ریزہ چُبھتا ہے
یہ آئینہ جسے تکتی رہی خُدائی تک

یہ حادثہ ہے، مرے ضبطِ حال کے ہاتھوں
سفید ہو گئی کاغذ پہ روشنائی تک

پکارتی رہیں آنکھیں چلا گیا ہے کوئی،
وہ اک سکوت تھا آواز سے دُہائی تک

نکل کے دیکھا قفس سے تو آنکھ بھر آئی
وہ فصلِ گُل کہ کھڑی تھی مری رہائی تک

غضب ہے ٹوٹ کے چاہا تھا شاؔذ نے جس کو
سُنا یہ رسم بھی تھی صورت آشنائی تک

○

کسی کا کوئی ٹھکانہ ہے کوئی ٹھور بھی ہے
یہ زندگی ہے کہیں اِس کا اور چھور بھی ہے

جُھلا رہا ہے یہ گہوارہ کون صدیوں سے!
ارے کسی نے یہ دیکھا کہ کوئی ڈور بھی ہے

ہر آدمی ہے یہاں جبر و اختیار کے ساتھ
مگر یہ دیکھ کسی کا کسی پہ زور بھی ہے

سُنے گا کوئی تو پھر کچھ اُسے سنائی نہ دے
کہ ہر سکوت کے پردے میں ایک شور بھی ہے

وہ حُسنِ عشق صفت ہے وہ عشقِ حُسن نما
وہ میرا چاند بھی ہے وہ مرا چکور بھی ہے

شکار کر کہ دلوں کے سُنہرے جنگل میں
ضرور رقص میں بدمست کوئی مور بھی ہے

ہزار جان سے ہم ایک ہیں، یہ سچ ہے، شاذ
رواج و رسم کا لیکن دلوں میں چور بھی ہے

"ٹائم کیپسول"

پہلا باب

مورّخ —

سُنو خاک پروردۂ رامؔ و گوتمؔ
تمہارے شب و روز ہم لکھ رہے ہیں
ہُما کیا زغن کیا کہ جمہوریت ہے
ہر اک پیچ بہ دستِ قسمت لکھ رہے ہیں
نہ پوچھو کہ اس بند مٹھی میں کیا ہے
یہ دیکھو کہ کس کا بھرم لکھ رہے ہیں
نظر میں بُنِ مُوئے زُلفِ وطن ہے
شکن در شکن، خَم بہ خَم لکھ رہے ہیں
کچھ ایسے خم و پیچ ہیں داستاں کے
کہ ہیں ہاتھ ساکت قلم لکھ رہے ہیں

تمہارے لہو کو حِنا رنگ کہہ کر
جو گذری ہے تم پر وہ کم لکھ رہے ہیں
تضاداتِ دیر و حرم کو چھپا کر
مفاداتِ دیر و حرم لکھ رہے ہیں
کراماتِ اہلِ ستم کو بھلا کر
خُرافاتِ اہلِ کرم لکھ رہے ہیں
صنم کو خُدا مصلحت کہہ رہی ہے
خُدا کو بنامِ صنم لکھ رہے ہیں
ہیں اپنوں کے خنجر سے گردن بُریدہ
پرایوں کے لیکن ستم لکھ رہے ہیں
ہر اک ریگ زار آبشارِ خُنک ہے
ہر اک خُشک مٹّی کو نم لکھ رہے ہیں
بہ ہر سُو معطّر ہے خوشبوئے گندم
کہ آسودگیِ شکم لکھ رہے ہیں
ہمیں سے ہے پاسِ مساواتِ آدم
کہ رہزن کو بھی محترم لکھ رہے ہیں
وجودِ بشر خیر اپنی جگہ پر
مگر ہم بیانِ عدم لکھ رہے ہیں
فسانہ طرازی ہے تاریخ گویا
کہ گردُوں کو زیرِ قدم لکھ رہے ہیں

دُوسرا باب

ایک سُہانی سحر ———

اور پھر آئی یہاں
ایک سُہانی سحر
ملک کی تقسیم پر
جسم جُدا ہو گئے
روئے زمیں پر مگر
زُلفِ دوتا ہو گئے
چاہا تھا افرنگ نے
خون کے دریا بہیں
شہر ہو سیلابِ خاک
قریہ و صحرا بہیں
وقتِ وداعِ حبیب
اُٹھ نہ سکا شور تک
کتنی براتیں گئیں
دِلّی سے لاہور تک
آنکھ میں ہندو کے نم
دل میں مُسلماں کے غم

سِکھ کا گریباں تھا چاک
ابنِ مسیح آب آب
سب کو جُدائی کا غم
بھائی کو بھائی کا غم
باہیں حمائل کیے
جب وہ چلے، رک پڑے
سوئے زمیں جُھک پڑے
ہندو، مُسلماں کے ساتھ
حد ہے کراچی گئے
اور مُسلماں، اِدھر
چھوڑنے ہندو کو آئے

پھر دمِ رخصت وہی
گریہ و زاری کی بات

پھر وہی عہدِ وفا
پھر وہی یاری کی بات
شیر و شکر مُلک مُلک
جنگ کہاں امن تھا

امن بھی امنِ دوام
منہ کے مزہ کے لیے
رنجشِ بے جا بھی تھی

جیسے چلے پل دو پل
عاشق و معشوق میں
پھولوں کی چھڑیوں کی مار
خنجرِ ابرو کا وار
پھر وہی کھُل کھیلنا
دردِ بہم جھیلنا

تیسرا باب

کہ خوشی سے مر گیا وہ ——

وہ عصا بہ دست پیکر
وہ برہنہ جسمِ انساں
جسے لوگ کہتے آئے
تھے، مہاتما، پیمبر
وہ تمام عمر اپنی
پئے نذرِ ہند لایا
اُسے سب نے تاج بخشا
اُسے تخت پر بٹھایا
ہوئے جب رہا قفس سے
ہوئی ختم جب غلامی

تو وطن کے خال و خد میں
نیا رنگ بھر گیا وہ
ہوئی اس قدر مسرت
کہ خوشی سے مر گیا وہ
یہی ہم نے بھی سُنا ہے
کہ خوشی بُری بلا ہے
اُسے آنے والی نسلیں
شب و روز اور روئیں
وہ جو بیج اس نے بویا
وہی بیج لوگ بوئیں
(دلِ دشمناں سلامت دلِ دوستاں نشانہ)

چوتھا باب

پانچ ہزار سال بعد ——

صفحۂ وقت رواں، شہرِ خموشاں کی طرح
کون ہیں یہ لوگ یا پرچھائیوں کا رقص ہے
اِن کے پیکر کیا ہوئے کس طرح سائے رہ گئے
کچھ اشارے مٹ چلے ہیں کچھ کنائے رہ گئے
جستجوئے صوت میں حرفِ پریشاں کی طرح
کوئی پیشانی تو ہو جس کی شکن پڑھ پائیں ہم

کوئی چہرہ تو ملے کوئی سراپا تو ملے
کِس کو دیکھیں جس سے اپنے آپ کو یاد آئیں ہم
آنکھ کے دریا میں اک آنسو کا قطرہ تو ملے
لب کے ساحل پر رُکے کوئی سفینہ لفظ کا
جاں کے گردابوں میں کوئی حشر برپا تو ملے
چھُو کے دیکھیں، کچھ نہیں، شانہ ہلائیں کچھ نہیں
آگے پیچھے چُپ کا مقتل، دائیں بائیں کچھ نہیں

پانچواں باب

پانچ ہزار سال بعد کا قاری ———— (الف)

کون تھے وہ لوگ کیا کیا لکھ گیا تاریخ ساز
شہد کے دھارے رواں تھے دودھ کی نہروں کے بیچ
نقرئی رستے، طلائی حاشیے کندن کے پیڑ
لُولُو و مرجاں کے فوّارے رواں شہروں کے بیچ
کیا فراغت تھی کہ سب محلوں میں رہتے تھے مگر
جھونپڑوں کے خواب کا ارماں نہ نکلا عُمر بھر
مژدۂ آسودہ حالی تھی شکستِ سامراج
خیر کے میداں میں اک دن شر نے بازی ہار دی
اور پھر چاروں طرف سے مَن برستا ہی گیا

نکہتِ گندم سے سارا ملک بستا ہی گیا
بھوک، فاقہ، خود کشی، مہنگائی، ہڑتال، احتجاج
حاکمِ دوراں نے اِن لفظوں کی گردن مار دی
دولتِ زیرِ زمیں جمہوریت پر وار دی

(ب)

کانچ کے گھر تھے سبھی کے کوئی پتھر ہی نہ تھا
روئی کے گالے ہوں جیسے بات یوں کرتے تھے لوگ
چال مکھن سے ملائم جیسے سرگوشی چلے
اِس قدر پاسِ وطن کے باب میں مرتے تھے لوگ
جب یہ فرمایا گیا "آرام ہے تم پر حرام"
سب عوام اپنے دل آراموں سے مل کر رو پڑے
اور پھر نعرہ یہ گونجا "جے جوان دجے کِسان"
ہر کِساں ہونے لگا آہستہ آہستہ جوان
ہر جواں نے زیرِ لب فرمایا "حاضر ہے کسان"
جب کہا اُس نے غریبی کو ہٹاؤ ہٹ گئی
دولتِ جمہوریت سب مفلسوں میں بٹ گئی

(ج)

سیر چشمی، آشتی، آسودگی، زندہ دلی

مذہبی بنیاد پر رسمِ عداوت ہی نہ تھی
سنکھ مسجد میں بجاتے تھے برہمن رات بھر
اور مندر میں اذانوں پر موذّن رات بھر
کیا زمانے لد گئے کیا ہو گئے یار آشنا
پنڈت احرام آشنا تھے شیخ زُنّار آشنا
سُرخ روئی، زر نصیبی، فربہی، خوش قسمتی
بھیک کا کیا ذکر کاسہ کی روایت ہی نہ تھی
ایک ہی مذہب تھا، بس اِنسانیت، اِنسانیت
وعظ، خطبہ، کیرتن، اشلوک، آیت ہی نہ تھی
رَت جگے منتے، کھنک جاتے تھے سوغاتوں کے تھال
لوگ ہاتھوں میں لئے پھرتے تھے خیراتوں کے تھال

(۵)

سب کے مُنھ میں تھیں زبانیں بے زباں کوئی نہ تھا
بولتے تھے اپنی اپنی بولیاں سارے پرند
ایک اُردو تھی کہ جس کا بول بالا تھا بہت
ناز سے پالی گئی جمہوریت کے دَور میں
اُس کے شاعر تھے بہت آسودہ حال و مطمئن
جب کوئی اہلِ قلم مرتا تو سارے ملک میں
بند ہو جاتے تھے سب دفتر، دُکانیں، راستے

کیا ہوئی وہ علم و فن کی قدر دانی ہائے ہائے
چھپ گیا زیرِ زمیں گنجِ معانی ہائے ہائے

چھٹا باب

حصارِ سنگِ گراں سے آگے ——

حصارِ سنگِ گراں سے آگے
اُدھر زمیں کی تہوں کے نیچے
دھرا ہے تابوت آگہی کا
فضا میں ہیں کُنمناہٹیں سی
شکستہ لفظوں کی آہٹیں سی

تمام الفاظ چل رہے ہیں
کفن سے باہر نکل رہے ہیں

کسی پرانے مکاں کے آگے
رُکی ہے لفظوں کی فوج دیکھو
کسی نے پھر کھٹ کھٹایا در کو
چراغ کی سانس رُک رہی ہے
صدا یہ آئی کہ آ بھی جاؤ
کہ کوئی پردہ نہیں رہا ہے

پھٹا پرانا، ادھورا بستر
کھنکتے ڈبے، شکستہ برتن
فسردہ بچے، دریدہ چادر
تمام لفظوں نے چپکے چپکے
کچھ اس طرح ایک دوسرے پر
نگاہ ڈالی کہ سارا منظر
دھوئیں کے بادل میں چھپ گیا ہے

حقیقتوں کے بلند ٹیلوں سے
لفظ نظّارہ کر رہے ہیں
سنہرے کھیتوں میں بھُجن کھڑے ہیں
ترازو پاسنگ سے جھکے ہیں
مِلوں کے تالے کراہتے ہیں
درخت کی شاخ میں پھنسی ہیں
وہ گردنیں، جن کی شہ رگوں میں
غیور و خود دار خُوں رواں ہے
نظر میں فریادِ آب و ناں ہے

قطارِ الفاظ رینگتی ہے
رُکی ہے شیشہ کے گھر کے آگے

سفید بُرّاق ٹوپیوں میں
بڑے بڑے لوگ کرسیوں پر
ڈٹے ہوئے ہیں، سُنہری کُندن
کے تھال میں ریوڑیاں لگی ہیں
بہ حسبِ منصب جو بَٹ رہی ہیں
نگاہیں لفظوں کی جُھک چلی ہیں

برہنہ سَر لفظ پھر رہے ہیں
نظارۂ نو بہ نو سے ڈر کر
بھنور میں حیرت کے گھر رہے ہیں
قدم قدم ہے گھنا اندھیرا
مسلسل آواز آرہی ہے
سُنو کہ ہر روز میرے سینہ پہ
گولیاں اب بھی چل رہی ہیں
کہ میرے سینہ کے روزنوں سے
جو کوئی جھانکے تو سیرِ ہندوستاں ملے گی
یہ گُل زمیں خوں فشاں ملے گی
مگر مرے ہونٹ ہنس رہے ہیں
مگر مرے ہاتھ اب بھی پرنام کر رہے ہیں
مرا عصا کھو گیا ہے لیکن

مجھے سہارے کی آرزو ہے
مجھے سہارے کی آرزو ہے

اُدھر شوالہ اِدھر ہے مسجد
رواں دواں لفظ کے سپاہی
اُداس ہے رات کی سیاہی
معاً صدائے کرخت آئی
خُدا سے بھگوان کی لڑائی
اُٹھا کے بھگوان سنکھ مسجد کو جا رہا ہے
خدا بھی منبر سے آ رہا ہے
شوالے کی گھنٹیاں پیا پے کھنک رہی ہیں
حرم کی محرابیں تک رہی ہیں

سپاہِ الفاظ سر جُھکائے
گذر رہی ہے کہ راستہ پر
سفید چادر میں منھ چُھپائے
کوئی شبیہہ، آشنا کی صُورت
اُداس ہے نقشِ پا کی صُورت
یہ پوچھتی ہے کہ ٹھہرو ٹھہرو
مرا ٹھکانہ کہاں ہے لفظو

مرا تو کوئی وطن نہیں ہے
یہ کس کے گھر میہمان ہوں میں
سُنا ہے کوئی زبان ہوں میں

اندھیرے رستوں کی خامشی میں
پریشاں الفاظ چل رہے ہیں
مجسّمے دُور شہ نشیں پر
ہزار پہلو بدل رہے ہیں
پھر ایک پتّھر نے یُوں پکارا
سُنو، اِدھر آؤ، گُنگ لفظو
تم اپنے تابوت سے نکل کر
کہاں چلے ہو، بھٹک رہے ہو
بھلا بتاؤ کہ کون ہوں میں
نہیں ــــ تو پھر اُس مجسّمہ پر
نگاہ ڈالو تو کہہ سکو گے
نہیں ــــ تو پھر اور آگے دیکھو
کئی ہیں، تم کس کو جانتے ہو؟
نہیں نہیں ہم سے کچھ نہ پوچھو
کہ ہم فقط لفظ ہیں، ہماری
بساط کیا ہے، حیات کیا ہے

اندھیری شب میں ہم اپنا مفہوم ڈھونڈھتے ہیں
تم اپنا مقسوم ڈھونڈھتے ہو
ہم اپنا مقسوم ڈھونڈھتے ہیں

اُداس شب دُکھ پِرو رہی ہے
سیاہ وُسعت کے حاشیہ پر
کہیں درختوں کے سبز جُھرمٹ میں فاختہ جیسے رو رہی ہے

○